زاہدہ حنا
منفرد تخلیق کی تنقیدی کہانی
آسیہ نازلی

آسیہ نازلی

Naveed Square. Urdu Bazar. Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com
City Book Point

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

کتاب : زاہدہ حنا— منفرد تخلیق کی تنقیدی کہانی

مصنفہ : آسیہ نازلی

تعداد : 500

سن اشاعت : 2021ء

قیمت : 450 روپے

☆-انتساب-☆

''عینی اور ''ہاجرہ'' کے نام

حسن ترتیب

صفحہ نمبر

اپنی بات

۷۰ء کی دہائی میں آسمان ادب پر درخشاں ستارے بن کر چمکنے والے لکھاریوں میں اسد محمد خان، حسن منظر، رضیہ فصیح احمد، اے خیام، رشید امجد، انور سجاد، خالدہ حسین، احمد ندیم قاسمی، بانو قدسیہ، منشا یاد وغیرہ شامل ہیں۔اسی دور میں زاہدہ حنا اپنے منفرد لب و لہجے اور اُسلوب کی بنا پر اپنی ایک الگ شناخت بناتی نظر آتی ہیں۔ان کا ادبی تخلیقی سرمایہ افسانہ، ناولٹ، مضامین تراجم اور کالموں پر مشتمل ہے جنہیں سیاسی، سماجی، معاشی، تاریخی، ادبی، اخلاقی، تانیثی موضوعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔زاہدہ حنا کے تین افسانوی مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے''، ''راہ میں اجل ہے'' اور ''رقصِ بسمل ہے'' اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

کسی بھی دَور کا ادب اس عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، تاریخی محرکات اور ماحول میں سانس لیتا ہے۔اس لیے ایک فکری کردار کا حامل ہوتا ہے۔زاہدہ حنا نے اپنے افسانوی مجموعوں میں اپنے عہد کی تاریخ رقم کی ہے کیونکہ ادوار یا زمانے خلا میں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ان کا مزاج مختلف عوامل کے زیرِ اثر اور درجہ بدرجہ ترتیب پاتا ہے اور تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے۔اکیسویں صدی کے اوّلین برسوں میں انسانی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی رُجحان کو سمجھنے کے لیے گزشتہ صدی میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔جنگِ عظیم اوّل اور دوم، ہیروشیما اور ناگاساکی کی ایٹمی تباہی و بربادی، برصغیر میں آزادی کی جدوجہد، پاکستان کا قیام، بڑے پیمانے پر لوگوں کی ہجرت، ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ، 9/11 اور کورونا کی وبا وہ واقعات ہیں جنہوں نے اکیسویں صدی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا اور چونکہ ادب اپنے عہد کی عکاسی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے اسی لیے زاہدہ حنا کی تحریراں تبدیلیوں اور انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کی عکاس ہے۔اُنہوں نے عالمی و ملکی سیاسی و سماجی منظرنامے کو تہہ دار بیانیہ کی صورت میں افسانوی پیرائے میں کمال مہارت سے بیان کیا۔وہ زندگی کا ایک نئے سرے سے

اپنے افسانوں میں ادراک کرتی نظر آتی ہیں۔

موجودہ عہد میں سیاست، جنگ، دہشت گردی اور تشدد کا منافع بخش کاروبار سمجھی جاتی ہے جو اپنے جلو میں بے پناہ تباہی و بربادی لیے ہے جس پر زاہدہ حنا کا قلم افسردہ دکھائی دیتا ہے لیکن یہ افسردگی کسی مخصوص خطے سے وابستہ نہیں۔ ان کی تحریر کی کوئی سرحد نہیں، کوئی سفارت خانہ نہیں، زبان یا تہذیب نہیں۔ ان کے اندر انسانیت کا دُکھ درد محسوس کرنے اور کرانے کی کمال صلاحیت موجود ہے۔ وہ افسانوں میں تاریخ، سیاست اور اساطیر سے مدد لیتی ہیں۔ یوں پوری دُنیا ان کے تاریخی شعور میں سمٹ آتی ہے۔

ہندو مسلم نفرت کو ہوا دینا برطانوی حکومت کا ایک اہم اور شاندار منصوبہ تھا کیونکہ استحصالی اقوام اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ نو آبادیاتی نظام اپنی کلاسیکی شکل میں برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اُنہوں نے ہندوستان کو بظاہر سیاسی آزادی دی، لیکن فکری، ذہنی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر زیرِ اثر رکھنے کے لیے Divide and Rule اور مذہبی عداوت کو فروغ دیا جس کا نتیجہ 1947ء میں تقسیم کے خوفناک عمل کی صورت میں سامنے آیا۔ برطانیہ کو صرف ہندوستان کے نقشے پر لکیریں کھینچنے میں دلچسپی تھی لیکن یہاں کے باسیوں نے سفاکی و درندگی کے ناقابلِ یقین نظارے دیکھے۔ تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ ہزاروں برس کے تعلقات، دوستیاں تباہ و برباد ہوئیں۔ جغرافیہ تبدیل ہوا۔ تاریخ کو غلط خطوط پر لکھا گیا۔ روایات کی نفی کی گئی اور لوگوں کے دل و دماغ پر صرف اور صرف نفرت کی ہی حکمرانی رہ گئی۔ زاہدہ حنا کا ناولٹ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' اسی خوفناک تقسیم کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے جس میں پرانے رشتوں کے ٹوٹنے اور نئے رشتوں کے بننے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

زاہدہ حنا ہجرت کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے ہاں ازل سے ہونے والی ہجرتوں کے خلاف احتجاج کا رویہ ملتا ہے کیونکہ وہ خود ایک منقسم خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے اس کرب کو بہتر طور پر سمجھتی ہیں۔

فرائیڈ کے نظریہ لاشعور نے دنیا کو بتایا کہ انسان ایک وقت دو دُنیاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے اور ادب کی دنیا میں 'لاشعور' کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ زاہدہ حنا بھی اسی دُنیا کی دریافت کے لیے متنوع تکنیکوں کا استعمال کرتی ہیں تاکہ اپنے کرداروں کے ذہن میں پوشیدہ

حقائق کو منظرِ عام پر لا سکیں۔

وہ زندگی کے دلچسپ اور غیر دلچسپ اوراق کو پلٹتی ہیں پھر یک لخت منظر سے نکل کر ناظر بن جاتی ہیں۔ طرزِ خطابت بدلتا ہے۔ کبھی وہ متکلم غائب کا صیغہ بن جاتی ہیں کبھی اپنے قارئین سے مخاطب نظر آتی ہے۔ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے وہ اپنے اس وجود سے مخاطب ہیں جو اس سے منظر سے باہر ہے یا جس کا ناظر اس کے ذہنی وجود کا سایہ ہے یا وہ خود سے خود کلامی کرتی نظر آتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی تلاش میں مصروف ہیں۔ ان کے فکشن میں حقیقت و افسانہ باہم مل گے ہیں۔ وہ اپنی صدا کو موت کے ساتھ اختتام پذیر ہونے والی ہر چیز اور زمانے سے پرے پہنچانا چاہتی ہیں۔

وہ ماضی کو دہراتے ہوئے تمثال آفرینی سے کام لیتی ہیں۔ لفظوں سے خاص نوعیت کی اور خاص روپ رکھنے والی تصاویر جنم لیتی ہیں۔ اپنی ذات کے تلاش کے سفر میں رنگ روشنیاں، خوشبوئیں، گیتوں کا ردھم بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ ماضی ان کی یادوں میں پوری جمالیاتی دلکشی کے ساتھ در آتا ہے۔

زاہدہ حنا بطور Feminist ایک مستحکم پہچان رکھتی ہے۔ ''عورت زندگی کا زنداں'' میں عورت کے شعورِ ذات اور تاریخ کے تناظر میں صدیوں سے عورتوں پر روار کھے گئے مظالم اور مذہب کے نام پر عائد کی گئی جکڑ بندیوں کو بیان کرتی ہیں اور عورت کی ذات کی شناخت کا سوال اُٹھاتی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کی پہچان رشتوں سے نہیں بلکہ اس کی صلاحیتوں سے کرنی چاہیے۔

اپنے لب ولہجہ کی بنا پر زاہدہ حنا کے کالم ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا مطمع نظر عدم تشدد کا حامل ایک پُرامن معاشرہ ہے۔ ان کا فوکس اس بات پر ہے کہ وہ کون سی سیاسی شخصیات، حکومتیں، ادارے اور افراد ہیں جو امن کے لیے مدد کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک پُرامن سماج کے قیام کے لیے علم سیاسیات کو وسیع پیمانے پر اعانت اور کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ سماج میں مسائل کی نوعیت اور امن کے درمیان موزونیت کا فقدان ہے۔ بہت ہی سخت الفاظ، طنزیہ لب و لہجہ میں حکومتی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں۔ ہمارا معاشرہ جس سیاسی، تہذیبی، تخلیقی انتشار کا شکار ہے اس میں زاہدہ حنا جیسی استقامت کم ہی قلم کاروں میں ملتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب راقم کا ڈاکٹر روبینہ ترین کی زیرِ نگرانی تحریر کیا گیا ایم فل کا تحقیقی مقالہ ہے جو ترامیم اور اضافوں کے بعد پیشِ خدمت ہے۔ مجھے امید ہے کہ صاحب علم و فکر اس کام کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے بلکہ اپنی قیمتی آراء سے بھی نوازیں گے۔

حمرا خلیق اور ڈاکٹر قاضی عابد نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مضامین عنایت کیے۔ ڈاکٹر ضیاء الحسن صاحب نے فلیپ لکھا۔ ان اصحاب کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے بھائیوں ایم۔ خالد فیاض اور ڈاکٹر مظہر عباس نے میری بھرپور مدد کی۔ میرے شریکِ حیات محمد عمر فاروق نے ہمیشہ میرے تعلیمی سفر میں آسانیاں پیدا کیں۔ والدین کی دعاؤں کے سبب زندگی کی ہر مشکل آسان ہوتی چلی گئی ہے۔

آسیہ نازلی

زاہدہ حنا کی تخلیقیت

آسیہ نازلی کی تنقیدی نظر سے

ڈاکٹر قاضی عابد

ایک زمانہ تھا جب پاکستانی دانشوروں کے شعبہ ہائے اُردو میں نوآبادیاتی تحقیق کا دَور دورہ تھا۔ کسی قدیم شاعر کی شاعری کی دریافت، کسی قدیم مخطوطے کی بازیافت، شاعر کی سوانح پر دادِ تحقیق اور کاتبین کی املائی اغلاط کی تصحیح کا کام تحقیق کے باب میں میراج سمجھی جاتی تھی۔ اِس کام کے کئی مثبت حوالے بھی سامنے آئے کہ اُردو کے بڑے بڑے شاعروں کی مستند سوانح میسر آئیں۔ اُن کے دواوین صحت متن کے مستند اُصولوں کی روشنی میں مدوّن ہوتے لیکن یوں بھی ہوا کہ کئی ایسے تخلیق کاروں کے حوالے سے بھی اِس نوع کے کام سامنے آئے جن کی خود اپنے ہی زمان و مکاں میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ رفتہ رفتہ یہ صورتِ حال تبدیل ہوئی اور نوآبادیاتی طرز کی تحقیق کا طلسم ان تازہ واردان نے توڑا جو دانش گاہوں میں متن کی تصحیح سے زیادہ اُس کی تفہیم کی نوع بہ نوع شکلوں پر زیادہ اعتقاد رکھتے تھے۔ نوجوان اساتذہ نے تنقید کے ہنر سے لیس ہوکر اپنے طالب علموں کی جو تربیت کی اِس سے اِن دانش گاہوں میں کاروبارِ نقد میں زیادہ تیز سرگرمی دیکھنے میں آئی۔ یوں ایک زمانے میں جس طرح حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور دیگر محققین کا نام گونجتا تھا وہیں اَب نوجوان ناقدین کے نام سامنے آنے لگے۔

اِس بدلتی ہوئی صورتِ حال میں کئی دانش گاہوں نے جدید ادب کو اپنے نصاب کا حصہ بنایا تو اِن جدید اور نئے لکھاریوں پر تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھے جانے کی روش آغاز ہوئی۔ یہ مقالہ بھی جو اَب کتابی صورت میں سامنے آ رہا ہے اِس بدلتی روایت کا حصہ ہے۔

زاہدہ حنا ہمارے عہد کی ایک اہم لکھاری اور دانش ور ہیں اُنہوں نے اپنی متنوع

حیثیات سے اُردوادب کی دنیا پر اپنے نقوش مرتب کیے۔ وہ کئی رسالوں کی مدیر رہیں، اب اُردو اور خاص طور پر کلاسیکی اُردو کی خدمت بجالانے والے ادارے سے منسلک ہیں۔ اخبار میں ادبی اور سیاسی کالم لکھتی ہیں، جس کا میرے جیسے لوگوں کو بہت انتظار رہتا ہے، مگر اُن کی سب سے اہم شناخت فکشن ہے۔ اُنھوں نے افسانے لکھے، ناولٹ تحریر کیے اور اُردو کی ادبی تاریخ میں اپنا نام روشن انداز میں ثبت کرادیا۔ وہ ایک روشن خیال اور خردافروز لکھاری ہیں۔ ان کے فکشن میں تاریخ اور عصرِ حاضر یوں آمیختہ ہوتا ہے کہ بہت کم لکھنے والے اِس قدرت کے حامل ہوتے ہیں۔ اِن کی کہانیوں میں اساطیری بُنت، تاریخی تجربے کی بازگشت اور اپنے زمانے کی سیاست، تہذیب اور تمدن کی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاسی صورتِ حال جو ہمارے عصر کے خرابے پر اپنا منفی اور مثبت اثر ڈال رہی ہے اِس کا تخلیقی اظہار اِن کی اہم خوبی ہے۔ اُن کی اخبار کے لیے لکھی گئی تحریریں بھی محض ایک دِن کی زندگی والی نہیں ہوتیں بلکہ اپنے موضوعات کے حسن اور اظہار کی بلاغت اور ادبی پن کی وجہ سے تنقیدی درجے میں داخل ہوجاتی ہیں۔

یہ کتاب بنیادی طور پر آسیہ نازلی کے ایم۔ افل کا مقالہ ہے جو زاہدہ حنا کے افسانوی ادب کا جائزہ لیتا ہے مگر اِس میں عام طور پر لکھے جانے والے مقالات کی نحوست نہیں ہے بلکہ یہ اُن کے افسانوی ادب کے موضوعات، تکنیک اور اُسلوبِ بیان کا ایسا جائزہ ہے کہ مستقبل کی ایک اچھی ناقد کی آمد کی نوید ہے۔ اِس کتاب کے مختلف ابواب میں زاہدہ حنا کی سوانح، افسانوں اور ناولٹ کے موضوعات تکنیک اور ہیئتی تجربات اور افسانوی اُسلوب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ اپنے معاصرین میں اُن کا ادبی مقام اور قامت کس درجے کی ہے۔ آسیہ نازلی نے اِس سلسلے میں جو مواد تلاش کیا اُس کے مقابلے اور اپنے تنقیدی تجزیے سے جو قابلِ قدر نتائج اخذ کیے ہیں وہ اُن کی علم وادب سے سنجیدہ شناسائی کا ثبوت ہے۔ اُن کے اندر مستقبل کی ایک اچھی ناقد کی خوبیاں نظر آرہی ہیں۔ یہ کتاب جہاں محترم زاہدہ حنا کی تخلیقی زندگی کے مختلف گوشوں کا تجزیہ کرتی ہے وہیں پر افسانوی ادب کی تنقید کی ایک نئی صورتِ حال کو بھی سامنے لاتی ہے۔ زاہدہ حنا جس طرح اپنے عصر کی تخلیقی گواہی ہیں اِسی طرح یہ کتاب بھی اُن کی تخلیقی دنیا کی اہم گواہی ہے۔

❁

میری زاہدہ سے زاہدہ حنا تک

حمرا خلیق

آسیہ نازلی نے لکھا ہے، ''زاہدہ حنا کثیر الجہت شخصیت ہیں، لیکن اردو ادب میں دو حوالوں سے مشہور ہیں۔ پہلی جہت کہانی کار کی اور دوسری کالم نگار کی۔ جس کی آواز بہت بلند اور طاقت ور ہے۔ وہ قلم کی مزدور ہیں، اسے انھوں نے اپنی طاقت بنایا اور ہمیشہ سچ کو فروغ دیا۔''

کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری جنرل مرحوم امام علی نازش نے کہا تھا، ''زاہدہ حنا ترقی پسند ادیب ہیں، ترقی پرست نہیں۔ وہ روایت شکن ہیں، قدر شکن نہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ تہذیبی قدریں خلا میں پیدا نہیں ہوتیں، بلکہ ہمارے ماضی کا ورثہ اور حال کا حصہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں سرکش ہیں۔ عورتوں کے حقوق اور کچلے ہوئے تمام طبقات کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ وہ تخلیقی اور ذاتی سطح پر اختلاف پوری قوت سے کرتی ہیں، لیکن تقریر ہو یا تحریر یا نجی گفتگو، تہذیب اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔''

سیّد مظہر جمیل صاحب فرماتے ہیں، ''زاہدہ کا پہلا مجموعہ 'قیدی سانس لیتا ہے' جس کے ذریعے افسانے کا ہڑکا ہوا قاری ایک ایسے دل کش، جاذبِ توجہ، پہلودار اور نئی معنویت کے حامل بیانیے سے لطف اندوز ہوا جو اس وقت کی بے حد تھکی ہوئی فضا میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے کے مصداق تھا۔''

فاطمہ حسن کہتی ہیں، ''زاہدہ کی کہانیاں پڑھ کر جو پہلا تاثر میرے ذہن میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں تین نمایاں جہتیں ہیں۔ وہ کسی ماہر مصور کی طرح ماحول اور کیفیت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ماضی، حال اور مستقبل کی تینوں جہتیں بھی سامنے لے آتی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں رومانی قنوطیت کی جگہ تلخ حقیقتوں نے لے لی ہے۔''

ستیہ پال آنند کا خیال ہے کہ ''مصنفہ کہیں کہیں منظر نگاری کی تفصیل میں ورجینا وولف سے بھی سبقت لے جاتی ہیں۔''

انتظار حسین نے زاہدہ حنا کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا تھا، ''میں نے زاہدہ حنا کے افسانے پڑھے اور بے کل ہو کر سوچا کہ یہ بی بی افسانہ لکھتی کس طرح ہے؟ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ یہ بی بی افسانہ لکھتی نہیں پورتی ہے۔''

ادیب سہیل ایک جگہ لکھتے ہیں: ''زاہدہ حنا کے زیرِ بحث افسانوں کے سلسلے میں اپنی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان کے افسانے پڑھتے ہوئے کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کا انجام اس طرح نہیں یوں ہونا چاہیے تھا۔''

حسینہ معین نے زاہدہ حنا کے بارے میں اس طرح اظہارِ خیال کیا، ''زاہدہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو تغیراتِ زمانہ کی مثال ہوتے ہیں۔ پہلی مرتبہ جب اس سے ملی تو وہ ایک عام سی لڑکی تھی جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، جب کہ اس نے کچھ، بلکہ بہت کچھ کرنا اپنا فرض سمجھ رکھا تھا۔ کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو ایک انقلاب آ چکا تھا۔ بڑے بڑے نام، موٹی موٹی کتابیں، مشکل سے مشکل اصطلاحیں۔''

شہناز پروین نے زاہدہ حنا کے اندازِ تحریر کے بارے میں کہا، ''زاہدہ کی خوب صورت تحریریں اس کے لیے گلاب بھی ہیں عذاب بھی۔ گلاب اس لیے کہ ان کی خوش بو ساری فضا کو مہکا دیتی ہے اور اس کا سحر اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ عذاب اس لیے کہ فکر اور سوچ کے منفرد انداز کی بنا پر شخصیت اتنی بھاری بھر کم ہو جاتی ہے کہ قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

یوں تو زاہدہ حنا کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا، لکھا گیا، سنا گیا، جب کہ میرے خیال میں اس کی علمیت، قابلیت، جہاں بھر کی معلومات اور اندازِ تحریر کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بہت کم ہے، لیکن تھوڑے بہت اقتباسات جو میں نے اوپر درج کیے ہیں یہ ان ادیبوں، مبصرین، قارئین اور ناقدین کی تحریروں سے لیے ہیں جنھوں نے زاہدہ حنا کی تحریریں خواہ افسانوں یا ناول کی شکل میں یا کالموں کی صورت میں پڑھی ہیں اور جو خود بھی ظاہر ہے ادب و فن کی اس سطح پر کھڑے ہیں کہ زاہدہ حنا کی تحریر کے بارے میں اظہارِ خیال کر سکیں۔

زاہدہ حنا اگر کہانی یا ناول لکھ رہی ہیں تو ان کے موضوعات، کرداروں کا موضوع کے لحاظ

سے انتخاب، کہانی پر عبور، زبان کی چاشنی، کرداروں کے جذبات خواہ وہ خوشی کے ہوں یا غم کے، ان کا اندازِ اظہار اور پھر کہانی اور کرداروں کی ایک دوسرے کے ساتھ بُنت قاری کو ایک ایسے جال میں جکڑ لیتے ہیں کہ ذہنی اور جذباتی طور پر وہ باہر نہیں نکل پاتا۔

ان کی ادبی خدمات کے بارے میں دنیا جانتی ہے۔ ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۶ء تک جنگ میں ''زم گرم'' کے عنوان سے اور ۲۰۰۶ء سے اب 2019ء تک ''ایکسپریس'' میں اسی عنوان کے تحت کالم نگاری کر رہی ہیں۔

''قیدی سانس لیتا ہے''، ''راہ میں اجل ہے''، ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ''رقص بسمل ہے''، افسانوں کے مجموعے۔ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی''، ''ناولٹ''، جس کا ہندی ترجمہ ۲۰۰۴ء میں وانی پرکاشن سے چھپا اور زبان پبلی کیشنز نے All Passion Spent کے عنوان سے انگریزی میں نیلم حسین کا کیا ہوا ترجمہ شائع کیا۔ ''عورت: زندگی کا زنداں'' کے عنوان سے مضامین کا مجموعہ شہرزاد پبلی کیشنز نے ۲۰۰۴ء میں چھاپا۔ ''اُمیدِ سحر کی بات سنو'' مضامین اور کالموں کا مجموعہ جسے پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی نے شائع کیا۔ ان کے افسانوں اور مضامین کی کتابیں ہندی میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

ان کے ایوارڈز کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، فیض ایوارڈ، ساغر صدیقی ایوارڈ، لٹریری پرفارمنس ایوارڈ، کے پی ایم ایوارڈ برائے بہترین افسانہ نگار، سندھ اسپیکر ایوارڈ، SAARC لٹریری ایوارڈ، پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ ۲۰۱۱ء، اور ابھی حال ہی میں انھیں ترقی پسند تحریک نے لائیو ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا ہے۔

یہ تو وہ زاہدہ حنا ہیں جن کو دنیا جانتی ہے، لیکن میں تو آپ کو اس زاہدہ کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں جو میری ہے، صرف میری۔

وہ ۵ / اکتوبر ۱۹۴۶ء کو بہار کے شہر سہسرام میں پیدا ہوئی، لیکن جس سے میرا تعلق ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا جس دن بہ قول خود اس کے ''کچے فرش اور دیواروں پر نمی ہے۔ اوپری منزل کو جاتا ہوا لکڑی کا زینہ بھیگا ہے۔ اس زینے کے ساتھ وہ منحنی سی لڑکی کھڑی ہے جو ململ کا کلف لگا دوپٹہ اوڑھے ہوئے ایک ٹیچر سے بحث کر رہی ہے کہ اسے نویں جماعت میں داخلہ کیوں نہیں مل سکتا۔''
جس ٹیچر سے وہ یہ بحث کر رہی تھی، وہ میں تھی۔

زاہدہ کو جماعت نہم میں داخلہ ملنا چاہیے تھا، لیکن ہمارے یہاں نویں جماعت میں کوئی نشست نہ تھی، اسے آٹھویں جماعت میں داخلہ مل سکتا تھا۔ کافی بحث ومباحثہ کے بعد وہ آٹھویں ہی میں داخلہ لینے کے لیے راضی ہوگئی، کیوں کہ وہ اسی اسکول میں پڑھنا چاہتی تھی۔ میں اس زمانے میں ہشتم اور نہم کے بعض سیکشنز کو اردو پڑھاتی تھی۔ شاید یہ میری خوش نصیبی تھی کہ زاہدہ حنا کو اسی سیکشن میں جگہ ملی جس کی اُردو میرے پاس تھی۔

ان اسکولوں میں جو سیکنڈری اسکول کہلاتے ہیں، آٹھویں کلاس کو مڈل کلاس کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسی اعتبار سے اس کلاس کے ہر مضمون کا نصاب بھی ہوتا ہے۔ اردو کے نصاب میں نثر، نظم، قواعد کے علاوہ مضمون نویسی بھی شامل ہوتی ہے اور ہفتے میں ایک دن مضمون لکھوایا جاتا ہے۔

حسبِ طریقہ میں کلاس کو مضمون لکھنے کے لیے کوئی عنوان جو اس جماعت کے معیار کے مطابق ہوتا، دے دیتی تھی۔ ہر پیریڈ چالیس منٹ کا ہوتا تھا۔ تمام طالبات اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق مضمون لکھ کر مجھے دے دیتیں، لیکن جب زاہدہ حنا کی کاپی میرے ہاتھ میں آتی اور اس کے لکھے ہوئے مضمون پر نظر پڑتی تو میں دیکھتی کہ اس نے صفحے کے صفحے سیاہ کیے ہوئے ہیں اور پھر کافی دیر تک یہی سوچتی رہتی کہ اس بچی نے تو اتنا سب کچھ صرف چالیس منٹ میں لکھ دیا ہے، لیکن مجھے پڑھنے میں وقت لگ جائے گا، مگر میں بھی شاید اسی کی طرح خبطی تھی۔ باقی طالبات کی کاپیاں جلدی جلدی چیک کرتی اور پھر زاہدہ کا ''کھاتا'' لے کر بیٹھ جاتی۔ اس وقت میرے ذہن میں دو باتیں آتیں۔ ایک تو یہ کہ بحیثیت ایک ٹیچر یہ میرا فرض ہے کہ میں جتنا اور جو کچھ اس نے لکھا ہے، اُسے دیانت داری سے پڑھوں اور اگر کچھ اصلاح کی ضرورت ہے تو وہ کروں، اور دوسرے یہ تجسس ہوتا کہ چالیس منٹ کے مختصر سے وقت میں اس لڑکی نے اتنا طویل مضمون لکھا ہے تو آخر اس میں کیا کچھ لکھ دیا ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی سوچتی کہ اس معمولی سے عنوان پر خدا جانے اس نے کیا کچھ لکھ ڈالا ہے، مگر جب میں پڑھنا شروع کرتی تو رفتہ رفتہ میری حیرت بڑھتی جاتی۔ مضمون کا عنوان جو کچھ بھی ہوتا، لیکن تحریر طویل ہونے کے باوجود عنوان سے اس کا ربط ٹوٹنے نہ پاتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ معلومات کا ایک سمندر ہے جو بغیر کسی رکاوٹ کے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے پاس خواہ وہ تاریخ ہو، جغرافیہ ہو، ادب ہو، مذہب ہو، سائنس ہو، سیاست ہو یا پھر ''جنرل نالج''، اس

کے پاس معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ میں اس کا مضمون شروع کرتی اور بغیر سانس لیے پڑھتی چلی جاتی۔ بہت غور کرتی کہ کہیں کوئی اصلاح کی گنجائش تو نہیں، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کبھی تو میں یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتی کہ عنوان بھی میں نے ناحق دیا، اسے آزاد چھوڑ دینا چاہیے تھا تاکہ جو کچھ اسے لکھنا تھا، جو ایک لاوا اس کے ذہن میں پک رہا ہے اور پھٹنے کے لیے بے قرار ہے، اس کا راستہ نہیں روکنا چاہیے تھا۔ وہ ہر موقعے پر ایک اعلیٰ مقام حاصل کرتی رہی خواہ جب اس نے اسکول کے رسالے میں بحیثیت مدیر کام کیا، یا دوسری غیر نصابی سرگرمیوں، مثلاً ڈراموں وغیرہ میں حصہ لیا۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یوں تو میں اس کی استاد اور وہ میری شاگرد تھی، لیکن اس کے علم کے دریا سے میں نے بھی بہت سے موتی چنے۔ میں نے اسے چند مہینے پڑھایا، لیکن اس کم عرصے کے تعلق کے باوجود ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی میرا اور اس کا رشتہ ختم ہونا تو درکنار اور زیادہ گہرا ہوتا گیا ہے۔

ہمارا رشتہ وہ رشتہ ہے جسے کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا، سوائے خلوص، قربت، اپنائیت اور محبت کے۔ یہ وہ محبت ہے جو سال ہا سال تک میری سال گرہ کے دن صبح ساڑھے سات بجے گھر کے دروازے پر دستک سن کر دروازہ کھولتے ہی زاہدہ کی شکل میں مجھے ملتی۔ جو ''حمرا آپا'' کے لیے ایک تحفہ لیے کھڑی نظر آتی۔ یہ وہ محبت ہے کہ جب زاہدہ ہمارے گھر کے چھوٹے سے باورچی خانہ میں پٹرے پر بیٹھ کر امی کا پکایا ہوا آلو گوشت بڑے شوق سے کھایا کرتی تھی۔ یہ وہ محبت ہے جو گھر کے دروازے کے ساتھ ساتھ دل کے دروازے پر بغیر دستک دیے داخل ہو گئی تھی۔

اس نے اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر اسلامیہ کالج فار ویمن سے گریجویشن کیا۔ مختلف رسائل میں اس کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ مختلف اداروں میں ملازمت کرتی رہی۔ اسی سلسلے میں ۱۹۸۷ء میں بی بی سی اُردو سروس میں پروگرام پروڈیوسر ہو کر لندن چلی گئی۔

وہ کہیں بھی رہی۔ کافی لمبے لمبے عرصے تک ہماری ملاقات نہیں ہو سکی، لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے دور ہی کب ہوئی۔ اب صرف میرا اور زاہدہ کا تعلق نہیں رہا تھا۔ میری امی، اس کی امی، بہن زیرک اور بھائی جادہ ہم سب کا بالکل اس طرح ایک دوسرے سے تعلق تھا جیسے ایک خاندان والوں کا ہوتا ہے۔ زاہدہ تو صرف امی کے ہاتھ کا آلو گوشت کھا کر ہی خوش ہو جاتی تھی، لیکن میں اس کی امی کے بنائے ہوئے بہاری کباب اور مونگ یا ماش کی دال کی میٹھی پھلکیاں کھانے کے

لیے بے چین رہتی تھی اور اکثر فرمائش کر کے بنوا بھی لیا کرتی تھی۔ہم لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا اکثر و بیشتر رہتا۔ میری تکلیفوں اور پریشانیوں پر زاہدہ دکھی ہوتی۔اس کی الجھنوں اور ان نامساعد حالات پر جن سے وہ اکثر گزری، میں غم کرتی رہی اور اس کی تکلیفوں سے نجات کے لیے دُعا۔

۱۹۶۴ء میں میری شادی ہوئی۔وہ ہر تقریب میں موجود رہی۔اس کی شادی ہوئی تو میں ان چند لوگوں میں شامل تھی جنھوں نے اس کی شادی میں شرکت کی تھی۔ہم دونوں کی جب بھی ملاقات ہوئی، گفتگو میں نہ عمر کی قید، نہ زبان کے استعمال میں احتیاط، نہ موضوعِ بحث میں کوئی جھجک ہمارے آڑے آئی۔

میرے بیٹے حارث اور طارق اسے زاہدہ آنٹی کہتے ہیں، جب کہ لفظ آنٹی سے ممکن ہے اتنی قربت کا احساس نہ ہوتا ہو جو میرے اور زاہدہ کے درمیان ہے، لیکن دونوں بچے اچھی طرح جانتے ہیں، سمجھتے ہیں اور ہم دونوں کے اس قریبی رشتے کا احترام بھی کرتے ہیں۔اس کی بیٹی فینی، تحسینا اور بیٹا زریون، سب مجھے حمرا خالہ کہتے ہیں، بلکہ جب چھوٹے تھے تو گارڈن والی خالہ کہا کرتے تھے۔چوں کہ اس زمانے میں ہم آفیسرز کالونی گارڈن روڈ میں رہتے تھے اور گاندھی گارڈن یعنی چڑیا گھر ہمارے گھر کے بہت قریب تھا، اس لیے جب زاہدہ حنا اور اس کے بچے ہمارے گھر آتے تو سب بچے چڑیا گھر ضرور جاتے۔

بچوں میں بھی ایک دوسرے سے نہایت بے تکلفی اور اپنائیت کا رشتہ ہے۔فینی چوں کہ زیادہ باتیں کرتی تھی، حارث اس کے منہ پر ٹیپ لگا کر کھانے کی میز کے نیچے بٹھا دیتا تھا، اور اب جب فینی ماشاءاللہ خود دو بچوں کی اماں جان ہیں، حارث کی یہ حرکت یاد کرتی ہے اور چوں کہ اب حارث بہت زیادہ باتیں کرتا ہے تو کہتی ہے، ''حمرا خالہ میرا دل چاہتا ہے کہ اب میں حارث بھائی کے منہ پر ٹیپ لگا دوں۔''

نسل در نسل محبت کے رشتے کا یہ سفر چلا آ رہا ہے۔زاہدہ کا اور میرا تعلق جو ۱۹۵۹ء میں ایک استاد اور شاگرد کے رشتے سے شروع ہوا تھا، 2019ء تک پہنچتے پہنچتے ساٹھ برس میں بہت گہرا اور مضبوط ہو گیا ہے۔

اس کے بچے، میرے بچے اور پھر ان بچوں کے بچے خلوص اور محبت کی ایک ڈور میں

بندھے ہوئے ہیں۔ایسی ڈور جسے کوئی کاٹ نہیں سکتا۔ایسا تعلق جسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔اس کی مضبوطی کا اندازہ آپ اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ میری بڑی بی حاجرہ جو ہمارے یہاں کھانا پکانے آتی تھیں، وہ بھی میرے اور زاہدہ کے رشتے کو اچھی طرح سمجھ گئی تھیں۔وہ زاہدہ کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتی تھیں جیسے گھر کے کسی فرد سے کیا جاتا ہے۔بدھ کی دوپہر کو زاہدہ ریڈیو پاکستان سے اپنا پروگرام ختم کر کے ہمارے گھر آجاتی تھی اور بڑی بی یہ پروا کیے بغیر کہ میں اسکول سے آئی ہوں یا نہیں، زاہدہ کو کھانا کھلا دیا کرتی تھیں، کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ نہ زاہدہ کو کوئی جھجک ہوگی اور نہ مجھے کوئی اعتراض۔

اس کی ترقی پر میں اسی طرح خوش ہوتی ہوں جس طرح حارث، طارق کی ترقی پر۔اس کے بچوں کو اوران کے بچوں کو کامیابی کا زینہ طے کرتا دیکھ کر میرا چلوؤں خون بڑھ جاتا ہے۔یہ بچے زاہدہ کے بچے ہیں۔بے شک میرا ان سے خون کا رشتہ نہ سہی، لیکن کسی کو کیا معلوم کہ میرا اوران کا ایسا رشتہ اور ایسی قربت ہے جسے الفاظ کا روپ نہیں دیا جاسکتا۔

۱۹۵۹ء میں کاسمو پولیٹن اسکول کے اوپر کی منزل کو جاتے ہوئے لکڑی کے بھیگے ہوئے زینے پر جس بچی نے قدم رکھا تھا، وہ اب ایسے بہت سے زینے طے کر کے بہت اوپر جا چکی ہے۔ترقی، شہرت اور کامیابیوں کا سفر طے کرتے ہوئے وہ ایک اعلیٰ مقام اور جہانِ ادب میں قابلِ فخر جگہ بنا چکی ہے۔دنیا اس کا نام نہایت احترام، عزت اور قدر سے لیتی ہے۔بات بھی صحیح ہے، چوں کہ سب اسے زاہدہ حنا کے نام سے پہچانتے ہیں۔اس کی ترقی اور کامیابی میرے لیے بھی قابلِ فخر ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ وہ زاہدہ حنا ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ میری زاہدہ ہے۔

بابِ اوّل:

زاہدہ حنا کی فکری اور ادبی تشکیل

زاہدہ حنا کی فکری اور ادبی تشکیل

زاہدہ حنا بطور افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، کالم نویس، مضمون نگار اور مترجم کے اُردو ادب میں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تحریروں کا خمیر بغاوت اور صداقت سے عبارت ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان کا فرد ہیں جو صدیوں سے جدید تعلیم یافتہ اور تازہ فکری بنیادیں رکھتا ہے۔ اس لاشعوری محرک، علمی برتری اور مطالعے کے شوق نے مل کر اُنھیں ایک منفرد مقام کی تلاش میں سرگرم رکھا اِس لیے اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ تقلید پر بغاوت کو فوقیت دی جائے، یوں بھی اُن کا شخصی و خاندانی پس منظر اُن کی تحریر میں ایک مربوط فکر میں ڈھلتا اور ارتقاء پذیر نظر آتا ہے۔ ان کی ادبی تشکیل میں مختلف عوامل کارفرما ہیں۔ اس باب میں فرداً فرداً ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

خاندان:

زاہدہ حنا کی شخصیت میں خاندانی پس منظر سے والہانہ عشق کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے'' کے 'پیش لفظ' میں لکھتی ہیں:

> ''کہانیاں جب کاتی جاتی ہیں تو ان کا سوت لکھنے والے کے پس منظر سے فراہم ہوتا ہے۔ میری کہانیوں کے سوت کا اگر حساب لگایا جائے تو وہ کچھ یوں ہے کہ قدیم گلدھ اور جدید بہار کا تاریخی شہر سہسرام میری جنم بھوی ہے ___ میرے وجود کی ترکیب میں مغل، عرب اور پٹھان عناصر شامل ہیں۔ دنیا کے تمام خاندانوں کی طرح میری خاندانی داستان بھی ہجرت سے عبارت ہے۔ ان ہجرتوں کے درمیان ہم نے منصفی اور سپہ گری کی، شعر کہے، کتابیں لکھیں۔ کبھی دربار میں بٹھائے گئے، کبھی بازاروں میں پھرائے گئے۔ انیسویں صدی میں ہم نے بغاوتوں کا سرنامہ لکھا اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہم میں سے کچھ برٹش راج کے ستون بنے۔

غرض ہم میں سے کچھ ظالموں کی فہرست میں کھڑے ہوئے۔ کچھ مظلوم
ٹھہرے اور دار ورَسن کی آزمائش سے گزرے۔'' [۱]

ان جملوں کی تفصیل جاننے کے لیے تاریخ کے اوراق پلٹنے پڑتے ہیں۔ زاہدہ حنا کا ننھیال اور دادیہال سہسرام کے زمیندار تھے۔ انگریزی تعلیم ان کے خاندان میں انیسویں صدی سے ہی عام ہوگئی تھی اس لیے ان کے خاندان کے کئی افراد جج، ڈپٹی کلکٹر، ڈاکٹر، وکیل اور پولیس آفیسر تھے۔

زاہدہ حنا کے دادا محمد یوسف علی کے مادری جد مرزا دلدار بیگ کمپنی بہادر کی فوج میں تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی تعیناتی جہلم کے قریب تھی جہاں اپنی اہلیہ وزیرالنساء اور اپنے بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔ انہوں نے جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور پھانسی پائی [۲]۔ ان کا مزار آج بھی دریائے جہلم کے کنارے موجود ہے اور ''دربارخاکی شاہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ شہید کی بیوہ بچوں کو لے کر ۱۸۵۸ء میں سہسرام پہنچیں اور وہیں دفن ہیں۔

مرزا دلدار بیگ کے بیٹے مرزا عبدالستار بیگ سہسرامی نے تین جلدوں پر مشتمل تاریخِ تصوف لکھی جس کا نام ''مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین'' [۳] ہے۔ اس کے نسخے انڈیا آفس لائبریری، لندن اور برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ اس بارے میں زاہدہ حنا کہتی ہیں:

''یہ کتاب تین ضخیم جلدوں میں ہے۔ جلد اوّل دو بار شائع ہوئی۔ اس کی جلد اوّل اور جلد دوم کی طباعت واشاعت مرزا عبدالستار بیگ کی زندگی میں ۱۹۱۴ء میں پہلے ہوئی، لیکن تیسری جلد ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔'' [۴]

زاہدہ حنا کے دادا محمد یوسف علی نے پریذیڈنسی کالج کلکتہ سے جدید تعلیم حاصل کی اور ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ ان کے والد ڈپٹی یوسف علی کے سب سے بڑے بیٹے محمد ابوالخیر تھے۔ مزاج میں آئیڈیلسٹ تھے۔ تعلیم کے بعد ملازمت کی بجائے آزاد رہنے کو ترجیح دی۔ انگریز سرکار سے سخت نفرت کرتے تھے۔ جس زمانے میں ان کے والد ڈپٹی کلکٹر تھے عین اس زمانے میں شورش اور بغاوت کے الزام میں ڈھائی برس کی جیل کاٹی۔ [۵]

زاہدہ حنا کی والدہ شمس النساء کے دادا دائرہ اسٹیٹ کے مینیجر تھے۔ ان کے ماموں ہائی

کورٹ کے جج اور چچا پولیس سروس میں تھے۔ وہ لیفٹیننٹ گورنر صوبہ بہار کے پرسنل اسٹاف میں بھی شامل رہے۔ زاہدہ حنا کی ننھیال اور دادیہال کی گذشتہ صدیوں کی تاریخ کا خلاصہ کنول رعنایوں بیان کرتی ہیں کہ

> ''مغل دور میں دیوان، قاضی، منصف، زمیندار اور کمان دار رہے اور برطانوی عہد میں جج، وکیل، ڈاکٹر، ڈپٹی کلکٹر، مجسٹریٹ، ادیب اور شاعر نظر آتے ہیں۔'' [٦]

سیاسی نظریات کے اعتبار سے ان کی دادیہال کے بیشتر افراد مسلم لیگی تھے۔ چنانچہ بیشتر قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان آ کر سکونت پذیر ہوئے جبکہ زاہدہ حنا کی نانہال قوم پرست تھی اس لیے تقریباً تمام ننھیالی رشتہ دار ہندوستان میں رہے۔ آزادی پاکستان کے بعد اب تک ان کے خاندان کے بعض افراد بہار کی لوک سبھا (صوبائی اسمبلی) کے رکن اور کانگریس کی صوبائی وزارتوں میں وزیر بھی رہے۔

پیدائش اور تعلیم:

زاہدہ حنا ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء [۷] کو ہندوستان میں صوبہ بہار کے تاریخی شہر سہسرام میں پیدا ہوئیں۔ ۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو والدین کے ساتھ ہجرت کر کے کراچی آئیں۔ ۱۹۵۱ء میں رسمِ بسم اللہ کے بعد ۱۹۵۸ء تک ساری تعلیم و تربیت گھر پر والد کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ انہوں نے ہی زاہدہ حنا کو فارسی، انگریزی، اُردو کے علاوہ تاریخ اور حساب کی بھی تعلیم دی۔ ۱۹۵۸ء میں سکول میں داخل ہوئیں۔ ۱۹۶۲ء میں کاسموپولیٹن گرلز سیکنڈری سکول سے میٹرک کیا۔ ۱۹۶۶ء میں کراچی کے اسلامیہ کالج فار وومن سے گریجوایشن کیا۔ [۸]

عملی زندگی:

زاہدہ حنا کی عملی زندگی کا آغاز میٹرک کے رزلٹ آنے سے قبل ہی ہو گیا تھا کیونکہ اُن کے والد شدید علیل تھے۔ گھر کی بڑی اولاد ہونے کے ناطے کفالت کی ذمہ داری زاہدہ حنا پر آن پڑی۔ ۱۹۶۲ء میں گرین ووڈ گرامر سکول میں بہ طور کیشئر دو شفٹوں میں ملازمت شروع کی [۹]۔ اسی دور میں کراچی کے ایک اشاعتی ادارے کے لیے پروف ریڈنگ کا کام بھی کیا۔ ۱۹۶۴ء میں نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازم ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء میں ہفت روزہ ''اخبارِ خواتین''

کی اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئیں۔ جہاں سے ان کا ٹرانسفر روزنامہ ''مشرق'' میں ہوگیا۔ وہاں انہوں نے سال بھر روزانہ کالم لکھے اور یوں ۱۹۶۷ء میں پاکستان کی سب سے کم عمر کالمسٹ کا اعزاز ملا[۱۰]۔اس کے بعد ڈھائی برس تک ''وائس آف امریکہ'' کے کراچی آفس میں بطور فیچر رائٹر اور پروگرام پروڈیوسر کام کیا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۲ء تک عالمی ڈائجسٹ کی مدیر رہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ''بی بی سی اُردو سروس'' میں پروگرام پروڈیوسر ہو کر لندن چلی گئیں، لیکن سوا سال بعد استعفیٰ دے کر واپس آ گئیں۔ ۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۶ء روزنامہ ''جنگ'' کے لیے ''نرم گرم'' کے عنوان سے کالم لکھے۔ ۲۰۰۶ء سے اب تک روزنامہ ''ایکسپریس'' کے لیے اسی عنوان سے کالم لکھ رہی ہیں[۱۱]۔اس کے علاوہ زاہدہ حنا کے ہفتہ وار کالم ہندی اخبار ''ڈینیک بھاسکر'' سندھی اخبار ''عبرت'' مین ترجمہ ہو کر شائع کیے جاتے ہیں۔ سعودی عرب کے اخبار ''اُردو نیوز'' اور لاہور کے ہفت روزہ ''زندگی'' میں بھی زاہدہ حنا کے کالم چھپتے ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے (۱) قیدی سانس لیتا ہے (۲) راہ میں اَجل ہے (۳) رقصِ بسمل ہے اور ایک ناولٹ 'نہ جنوں رہا نہ پری رہی' اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

زاہدہ حنا کی کہانیاں سندھی، ہندی، پنجابی، گورمکھی، بنگلہ اور انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ان کہانیوں کو ترجمہ کرنے والوں میں فیض احمد فیض، امرتا پریتم، چندرتن، پروفیسر محمد عمر میمن، پروفیسر سی ایم نعیم، ثمینہ رحمٰن، جاوید آنند اور انور عنایت اللہ شامل ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے اُردو افسانوں کے بارہ منتخب مجموعوں میں زاہدہ حنا کی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ انگریزی کی Anthologies میں زاہدہ حنا کی کہانیاں چھپ چکی ہیں۔ یہ Anthologies پاکستان، ہندوستان اور امریکہ سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1. Contemporary Urdu Short, Sterlign Publishers, Dehli India.
2. Annual of Urdu Short Stories No. 4, University of Berkeley, California, USA.
3. Annual of Urdu Short Stories NO. 6, University of

Berkely, California, USA.

4. Pakistani Literature, "Women Writtings" Academy of Letters, Islamabad, Pakistan.

5. "In Her Own Write" Short Stories by Women Writers in Pakistan, ASR Publishers, Lahore, Pakistan.[۱۲]

6. "Fire in An Autumn Garden", Oxford University Press, Karachi, Pakistan.

7. Maping Memories "Khata", New Delhi, India.

8. "Engendering the Nation State", A Simorgh Publication, Lahore, Pakistan.[۱۳]

یورپی ائیر بک، آسٹریلیا ائیر بک، پاکستان وومن ائیر بک، امریکن بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کی شائع کردہ ''وومن آف دی ائیر'' ۱۹۹۷ء میں اُن کا نام کام کی بنیاد پر شامل ہے۔[۱۴]

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے جوبلی سیریز میں "Fires in an Autumn Garden" شائع کی ہے۔ جس میں ۵۰ برس کی اُردو اور علاقائی کہانیوں کا انتخاب شامل ہے۔ زاہدہ حنا کی کہانی اس میں شامل ہے۔ ان کا نام جین ای ملر کی مرتب کردہ کتاب "Who is who in contemporary Women's Writing", 2001 میں بھی شامل ہے۔[۱۵]

زاہدہ حنا نے پاکستان، امریکہ، انگلستان، متحدہ عرب امارات، ہندوستان کے مختلف سیمیناروں میں شرکت کی اور تقریباً ۱۰۰ سے زائد مقالے پڑھے ہیں۔ ان کی علمی وادبی خدمات کے بدلے میں مختلف ایوارڈ ملے۔ جن میں فیض ایوارڈ، ساغر صدیقی ایوارڈ، لٹریری پرفارمنس ایوارڈ، کے پی ایم ایوارڈ برائے بہترین افسانہ نگار، سندھ سپیکر ایوارڈ شامل ہیں اور ۲۰۰۱ء میں "SAARC" فاؤنڈیشن آف لٹریچر کی اُردو کی بہترین لکھاری کا انعام دیا گیا۔[۱۶]

جنرل پرویز مشرف کے عہد میں زاہدہ حنا کو ۲۰۰۶ء میں ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''پرائڈ آف پرفارمنس'' دینے کا اعلان کیا گیا جسے اُنھوں نے فوجی ڈکٹیٹر سے لینا گوارہ نہ

کیا کیونکہ یہ اُن کی نظریاتی کمٹ منٹ کے خلاف تھا[۱۷] وہ اکتوبر۱۹۹۹ء سے ہی فوجی آمریت کے خلاف لکھ رہی تھیں۔

پیپلز پارٹی کی حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد۲۰۱۱ء میں اُنہیں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' دوبارہ دیا گیا۔زاہدہ حنا کے کئی لانگ پلے پاکستان ٹیلی وژن اور پرائیویٹ چینلز پر نشر ہو چکے ہیں،لیکن ڈرامہ نگاری کو انہوں نے باقاعدہ اپنا پیشہ نہیں بنایا۔یہی وجہ ہے کہ چند مقبول ڈراموں کے باوجود اُنہوں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ہارون رند نے ''زرد پتوں کا بن'' قاسم جلالی ''یہ کیسی زندگی ہے؟'' اور ''خواب مرتے نہیں'' کو ساحرہ کاظمی نے پروڈیوس کیا۔ان کا ایک سیریل ''پرستار'' محسن شیرازی نے پروڈیوس کیا۔ان کے ڈرامے ''دوسری دُنیا'' کو ۲۰۰۰ء میں بہترین ''پرائیویٹ پروڈکشن'' کا پی ٹی وی ایوارڈ ملا۔[۱۸]

ازدواجی زندگی:

زاہدہ حنا کی شادی اُردو ادب کی مشہور شخصیت جون ایلیا سے اکتوبر۱۹۷۰ء میں ہوئی [۱۹] لیکن ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب کامیاب نہ ہو سکی۔حسینہ معین زاہدہ حنا کی زندگی کے اس دور کو یوں بیان کرتی ہیں:

> ''دُنیا کے پھندے سے تو بی بی بچ نکلیں،لیکن اس زمانے میں عشق کے دیوتا نے براہِ راست ان کی آنکھوں پر حملہ کیا___ سُنا ہے عشق اندھا ہوتا ہے،لیکن ہمیں تو ہمیشہ زاہدہ حنا کی آنکھوں پر شک رہا اس کے بعد کی ملاقاتوں میں ہم نے اُنہیں سرشار پایا کچھ حالت جذب کی سی تھی،اور کچھ عالم مجذوبوں کا سا ہم نے کچھ کہنا چاہا۔اُنہیں ٹوکنا چاہا مگر اس خیال سے کچھ نہ کہا کہ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا___ ہاں تو بڑے معرکوں کے بعد عشق کے سہرا بندھا اور جیسا کہ عموماً ہوتا ہے چند ہی دنوں میں زاہدہ حنا پر بھی یہ کھلا کہ
>
> ہیں کواکب کچھ ، نظر آتے ہیں کچھ
> دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا'' [۲۰]

۱۹۸۸ء میں دونوں کی علیحدگی ہوگئی اور باقاعدہ طور پر جون ایلیا نے زاہدہ حنا کو ۱۹۹۲ء

میں خلع لکھ کر دی۔ زاہدہ حنا اس رشتے کے حوالے سے کہتی ہیں:

''ہر رشتے کی جُدا جہتیں ہیں اور ان جہتوں میں ایک جون ایلیا ہے۔ اس سے ذہنی رفاقت کا تیرہ سالہ پُرانا رشتہ ہے۔ میں نے ذہنی رفاقت کے اس سفر میں بہت کچھ سیکھا ہے بہت کچھ کھویا ہے بہت کچھ پایا ہے۔'' [۲۱]

زاہدہ حنا نے جون ایلیا کی شخصیت اور ان کے علمی و ادبی گھرانے سے کیا فیض حاصل کیا ہے۔ اس متعلق بات کرنے سے گریز کرتی ہیں۔

زاہدہ حنا اور جون ایلیا کے تین بچے ہیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش مندرجہ ذیل ہے:

فینانہ	۱۰ اگست ۱۹۷۱ء	
سحینا	۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء	
ذریون	۶ مئی ۱۹۷۹ء	[۲۲]

زاہدہ حنا انتہائی وضعدار اور نفیس خاتون ہیں۔ وہ مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتیں اور نہ ہی اپنی علیحدگی کو ڈرامائی رنگ دے کر جون ایلیا کی بُرائیاں کرتی ہیں۔ علیحدگی سے متعلق سوال کا جواب انتہائی بُردباری سے اس طرح دیتی ہیں:

''ایک عورت اور ایک مرد کا ساتھ رہنا یا ساتھ رہتے رہتے جُدا ہو جانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں۔ مہذب طریقہ یہی ہے کہ دو افراد ساتھ رہنے کے بعد اگر جُدا ہو جائیں تو اس کی تشہیر نہیں کرتے اور نہ اس بارے میں ذو معنی یا غلط بیان دیتے ہیں۔ میں اپنے اور جون ایلیا کے تعلق کے بارے میں کچھ کہنا اپنے اور ان کے خاندان کی حُرمت اور اس رشتے کے وقار کے منافی سمجھتی ہوں جو ہمارے تین بچوں کی وجہ سے ہمارے درمیان قائم ہے اور رہے گا۔ میرے خیال میں یہ نازک تعلق بہت احتیاط کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا اس بارے میں مزید گفتگو میرے لیے ممکن نہیں۔'' [۲۳]

صحافتی زندگی:

زاہدہ حنا نے کم عمری سے ہی کالم نگاری کی ابتداء کر دی تھی، لیکن باقاعدہ طور پر گریجویشن کے بعد ۱۹۶۶ء میں ''اخبارِ خواتین' سے وابستہ ہونے کے بعد اسے بطور پیشہ اپنالیا اور آج تک اسی پیشے سے وابستہ ہیں۔ زاہدہ حنا اپنی باقاعدہ صحافتی زندگی کے بارے میں اپنے کالم ''طاقتِ پرواز ہونی چاہیے'' میں لکھتی ہیں:

> ''میں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ''اخبارِ خواتین' سے ۱۹۶۶ء میں کیا جب اس جریدے کا آغاز ہوا۔ روزنامہ 'مشرق' کراچی نے سوسائٹی میگزین کی بنیاد پر ہفتہ وار جاری کیا۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا ہفت روزہ' تھا جو کسی روزنامہ کے تحت شائع ہوا۔'' [۲۴]

زاہدہ حنا کالم نویس کی حیثیت سے پاکستان اور پاکستان سے باہر اُردو کے اخبار بینوں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

کالم کسی بھی موضوع پر کالم نگار کی سوچ کا عکس ہوتا ہے۔ زاہدہ حنا کے کالموں کے ساتھ ہی ایک خاص انداز اور رنگ سے لکھی تحریر کا عکس اُبھرتا ہے۔ وہ سیاست، تاریخ، سماجی مسائل، ادبی معاملات، عورتوں کے حقوق اور دیگر اہم موضوعات پر ایک نئے انداز سے قلم اُٹھاتی ہیں۔ ان کے کالم صرف معاشرے کے عکاسی ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے بہت بڑے ناقد بھی ہیں۔

اُن کا قلم کسی خاص ملک یا خطے کے متعلق کالم تحریر نہیں کرتا بلکہ دُنیا میں جہاں جہاں جنگ وظلم کا بازار گرم ہے اور جہاں جہاں ابنِ آدم پر ظلم وستم کیا جارہا ہے۔ اس پر اُنہوں نے بڑے پُر اثر کالم تحریر کیے ہیں جن میں درد کی آنچ سب سے نمایاں ہے۔

زاہدہ حنا کا تاریخ کا وسیع مطالعہ ہے وہ جس خطے کو اپنے کالم کا موضوع بناتی ہیں وہ اپنے درخشاں ماضی اور حال کی تباہی و بربادی کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس بارے میں ڈاکٹر سید احمد جعفر رقم طراز ہیں:

> ''میری دانست میں زاہدہ حنا کی اصل طاقت تاریخ اور کلاسیکی ادب کا اُن کا مطالعہ ہے اس مطالعے نے ان کو ایک ایسی بصیرت سے ہمکنار کیا ہے جو ان کو اپنے زمانے کے خدوخال اور اس میں جاری کشمکشِ حیات کی

حرکیات کو سمجھنے کی معتد بہ اہلیت فراہم کر دیتا ہے۔‘‘[۲۵]

زاہدہ حنا کے کالموں میں تاریخ کے ساتھ ساتھ تاسف کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ تاریخی واقعات اور افراد کا حال سے موازنہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہوگئی ہے۔ اب ماضی جیسا کچھ بھی نہیں رہا۔ اُمید کی کرن نظر نہیں آ رہی۔

وہ اپنی تحریروں میں نڈر، بے باک اور حقیقت پسند شخصیت کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ بے خوفی اور بہادری ان کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے جو اُن کے کالموں سے نمایاں ہے۔ ہمارے ہاں ابتداء سے ہی ڈکٹیٹر شپ رہی۔ حق اور سچ کے لیے آواز اُٹھانے والے لوگوں کو ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کی سخت سزائیں اُنہیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، لیکن زاہدہ حنا آوازِ حق بلند کرنے والے اُن سرفروشوں میں نمایاں مقام رکھتی ہیں جو بانگِ دہل سچ بیان کرتے ہیں، لیکن صحافت میں سچ بولنے کی قیمت چُکانی پڑتی ہے اور اس حقیقت سے زاہدہ حنا بخوبی واقف بھی ہیں کہ صحافت ایک خاردار پیشہ ہے۔ لکھتی ہیں کہ

> ’’آج صحافت سے وابستہ ہونے والی خواتین کی زندگی پہلے سے بہت مشکل ہو چکی ہے۔ صحافت اب مردوں کے لیے ہی نہیں بلکہ خواتین کے لیے بھی ایک خطرناک پیشہ بن گیا ہے۔ ہمارے ہاں انتہا پسندی دہشت گردی اور عسکریت پسندی کا وہ سیلاب اُمڈ آیا ہے جس میں جہاں بہت سی خوبصورت قدریں بہہ گئیں وہاں صحافیوں کی جان پر بن آئی ہے۔ صحافت سے وابستہ مرد اور خواتین دونوں ہی نہایت مشکل میں ہیں۔‘‘[۲۶]

لیکن اس مشکل پیشے میں زاہدہ حنا خواتین کی آمد کو خوش آئند سمجھتی ہیں کیونکہ اب عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ ہر میدان میں کام کرتی نظر آتی ہے۔ اب عورت و مرد کی تخصیص کسی شعبے میں نہیں رہی۔ ضرورت ہے تو اس بات کی کہ موضوعات میں جدت ہونی چاہیے اور ان موضوعات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جدید ذرائع آلات استعمال کرنے چاہئیں۔ وہ خواتین کو حوصلہ اور ہمت دلاتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ’’سب سے اہم بات یہ ہے کہ صحافی خواتین یہ سمجھنا چھوڑ دیں کہ وہ صرف

عورتوں یا ان سے متعلق معاملات و موضوعات پر ہی لکھ سکتی ہیں۔
موضوعات کا آسمان ان کے سامنے ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ
طاقتِ پرواز ہونی چاہیے۔ اُنہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ اگر وہ عورت
ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ صرف خواتین کے ساتھ ہونے
والے تشدد، گھریلوٹوٹکوں، خواتین کے انٹرویو یا کھانے پکانے اور آپ
کیسے دلکش نظر آسکتی ہیں جیسے موضوعات تک محدود ہو کر رہ جائیں۔ دُنیا
ان کے سامنے جس طرح کھل گئی ہے اس کے اُفق جس طرح وسیع ہوئے
ہیں اس میں پرواز ہی اُنہیں نت نئے موضوعات کا پتہ دے گی۔'' [۲۷]

زاہدہ حنا کے ہاں موضوعات کی جدت نمایاں ہے۔ وہ تاریخ، سیاست، ادب، سائنس، آرٹ، انسانی حقوق غرض ہر موضوع پر بے دھڑک قلم اُٹھاتی ہیں اور معلومات افزاء کالم تحریر کرتی ہیں۔ یہ معلومات سرسری یا سطحی نہیں ہوتیں بلکہ منطقی استدلال اور اعداد و شمار کا استعمال ان کو مستحکم بناتا ہے۔ زاہدہ حنا اپنے کالموں کے بارے میں کہتی ہیں:

''کالم تحریر کرتے ہوئے میری ترجیح ہوتی ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ
معلومات فراہم کرسکوں تاکہ لوگوں کے علم میں اضافہ ہو اور یہ کالم انہیں
اس موضوع پر مزید تحقیق کے لیے راغب کریں۔'' [۲۸]

زاہدہ حنا کے کالم نہ صرف قاری کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ اپنی فکر انگیزی کے سبب قاری پر دیرپا اثر بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے کالم قارئین میں بے حد مقبول ہیں۔ 'سیاست' ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ عالمی و ملکی سیاست پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ عہدِ حاضر میں انسانوں کی تقدیر کا بیان اب سیاست کی زبانی ہوتا ہے کیونکہ ادارے ہی سیاست نہیں کر رہے بلکہ فلاحی اور سماجی تنظیموں سے لے کر اخلاقی و مذہبی ادارے تک سیاست کا حصہ بن چکے ہیں۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ افراد ہی نہیں ملک بھی سیاست کی اِس بساط پر اِس عہد میں مہرے بنے ہوئے ہیں۔ عالمی سیاست اور اس حوالے سے ملکی سیاست پر زاہدہ حنا واضح اور دوٹوک انداز میں اپنی رائے کا اظہار کالموں میں کرتی ہیں۔

ادبی زندگی:

زاہدہ حنا اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے ہاں خواتین کی تعلیم و تربیت پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ان کی پردادی فارسی اور اُردو پڑھی ہوئی تھیں۔ ان کی دو پھپھیاں بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں کلکتہ کے سہروردیہ سکول میں پڑھاتی تھیں۔ ان کی نانی اور والدہ بھی فارسی اور اُردو کی تعلیم رکھتی تھیں۔ والدہ اپنے جہیز میں سونے کے گہنوں اور قیمتی سامان کے ساتھ ساتھ کتب سے بھرے صندوق بھی لائی تھیں۔ ان کی ذاتی لائبریری داستانوں، ناولوں، کہانیوں کے مجموعوں اور رسالوں ''عصمت''، ''نگار'' اور ''ساقی'' کی جلدوں پر مشتمل تھی۔[۲۹]

زاہدہ حنا کی والدہ نے تین برس کی عمر سے ہی ہر رات اُنہیں طلسم ہوش رُبا، الف لیلیٰ، انوارِ سہیلی، شیخ سعدی اور حکیم لقمان کی حکایات سنانا شروع کر دی تھیں۔[۳۰]

زاہدہ حنا کی رسمِ بسم ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء تک ان کی تعلیم و تربیت گھر پر والد کی زیرِ نگرانی ہوئی۔ فارسی، اُردو، انگریزی، تاریخ، حساب کی تعلیم زاہدہ حنا نے اپنے والد سے حاصل کی۔ بہت ہی محنت، ریاضت اور استقامت کے ساتھ والد نے اُن کو پڑھایا۔ ان کی محنت کا عکس زاہدہ حنا کی شخصیت میں نمایاں جھلکتا ہے۔

زاہدہ حنا کو قلم اور لفظ سے محبت اور اُن کی طاقت کا احساس شروع ہی سے تھا۔ اپنے مضمون ''اکثر شبِ تنہائی میں'' لکھتی ہیں:

> ''ملتانی مٹی سے لپی ہوئی تختی سے کنڈے کے قلم کو سیاہی میں ڈبو کر میں نے جب کسی دوسرے ہاتھ کی گرفت کے بغیر ابجد کی تختی لکھی تو اپنے لکھے ہوئے ان ٹیڑھے میڑھے اور بدنما لفظوں پر خود ہی ہزار جان سے عاشق ہوگئی 'میں لکھ سکتی ہوں' یہ خیال ذہن میں بجلی کا کوندا بن کر لپک گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بھی لکھنے والی بننا ہے ___ لکھی ہوئی تختی کو آنگن میں بیٹھ کر نل کے نیچے دھونے کا سنسنی خیز تجربہ، پانی لکھے ہوئے لفظوں کو بہائے لے جا رہا ہے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ میرا شہر سمندر کے کنارے آباد ہے میرے لکھے ہوئے یہ حرف یقیناً سمندر میں جا رہے ہیں اور وہاں سے تیرتے ہوئے کہاں کہاں کی سیر کو جائیں گے۔''[۳۱] ☆۱

لفظوں کی تاثیر اور اہمیت سے زاہدہ حنا بخوبی واقف ہیں اور لکھنے کی صلاحیت انہیں قدرت سے ودیعت ہوئی ہے۔اس لیے ۹ برس کی عمر میں ہی پہلی کہانی لکھی۔ وہ شروع ہی سے مروجہ روش سے ہٹ کر سوچنے اور چلنے کی عادی ہیں کیونکہ ان کی طبیعت میں انحراف کا عنصر موروثی ہے۔ جب سکول میں داخل ہوئیں تو اپنا نام زاہدہ ابوالخیر سے تبدیل کر کے 'زاہدہ حنا' تحریر کرنا شروع کر دیا۔اس تبدیلی کے متعلق وہ کہتی ہیں:

> ''میرے لیے یہ بات ہوش سنبھالتے ساتھ ہی نا قابلِ برداشت تھی کہ کسی مرد کی وجہ سے کل کو مجھے اپنا نام تبدیل کر کے اس کے ساتھ جوڑنا پڑے گا یعنی میری ذات بھی نام کی طرح اس کے تعارف کی محتاج ہو جائے گی۔ اس لیے میں نے اپنا نام تبدیل کر کے 'زاہدہ حنا' تحریر کرنا شروع کر دیا۔'' [۳۲]

نام کی اس تبدیلی کے بارے میں زاہدہ حنا کی اُستاد حمرا خلیق یوں رقم طراز ہیں:

> ''نویں میں وہ 'زاہدہ ابوالخیر' سے 'زاہدہ حنا' ہوگئی۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگی 'میں ادیب بننا چاہتی ہوں۔ یہ سُن کر مجھے ایک بار پھر حیرت ہوئی کہ لڑکیاں ڈاکٹر یا پروفیسر بننے کے خواب دیکھتی تھیں۔'' [۳۳]

زاہدہ حنا کی شخصیت اور تحریر ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر یا پروفیسر بننا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

زاہدہ حنا ایک ایسے شجر کی مانند ہیں جس کی نشوونما میں کئی پشتوں نے حصہ لیا اور اسے اپنی علمی، ادبی اور جہد مسلسل کی روایت سے سیراب کیا۔ زاہدہ حنا کے ہاں فکر و نظر کی گہرائی، تحریر و تقریر میں بلا کا اعتماد اور تاریخ و ادب سے لگن اُنہیں وراثت میں ملی تھی۔ ایک ایسا خاندان جہاں علم و ادب ہی اوڑھنا بچھونا ہو جس کے بیشتر افراد فارسی اور اُردو ادب کے دلدادہ ہوں۔ وہاں نشوونما پانے والے بچے ادب سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور خاندان کے ادبی تسلسل کو آگے بڑھاتے نظر آتے ہیں۔ زاہدہ حنا نے آنکھ کھولتے ساتھ ہی ہر طرف کتب کی حکمرانی دیکھی۔ ان حالات میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انہیں علم و ادب سے لگاؤ نہ ہو۔

۱۹۵۹ء میں زاہدہ حنا کی پہلی تحریر سکول میگزین ''ارم'' میں شائع ہوئی۔[۳۴] یہ ٹیپو

سلطان کے بارے میں مضمون تھا جسے سال کے بہترین مضمون کا ایوارڈ بھی ملا۔ زاہدہ حنا کو شروع ہی سے تاریخ سے دلچسپی تھی اس لیے اتنی کم عمر ہی میں ٹیپو سلطان جیسی شخصیت کو موضوع تحریر بنایا۔ وہ سکول میگزین ''ارم'' کی دو سال مدیر رہیں اور تین سال بہترین نثر نگار کا ایوارڈ لیا۔ ان کی استاد حمرا خلیق نے مضمون نگاری کی مشق کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

زاہدہ حنا کا پہلا مضمون ۱۹۶۲ء میں ''انشاء'' کراچی سے شائع ہوا اور پہلا افسانہ ۱۹۶۴ء میں ''ہم قلم'' کراچی سے شائع ہوا [۳۵] ☆ ۲۔ کم عمری سے ہی ان کی تحریریں مقبول ہونا شروع ہوگئی تھیں۔ زاہدہ حنا کی فکری اور ادبی تشکیل میں وراثت کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

> ''آج میں جو کچھ ہوں اس کا سبب خاندانی پس منظر، والد کی دی ہوئی نصابی تعلیم اور والدہ کی سنائی ہوئی حکایات اور کہانیاں اور بعض اساتذہ کی توجہ ہے۔'' [۳۶]

زاہدہ حنا نے زندگی کو گھر کی چار دیواری میں عیش و آرام کے ساتھ کتابیں پڑھنے اور شوقیہ لکھنے میں نہیں گزارا بلکہ زندگی کو بہت محنت و جدوجہد کرتے ہوئے گزارا ہے۔ میٹرک سے ہی عملی زندگی کا آغاز ہونے کے بعد سے آج تک زاہدہ حنا کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ زندگی سے حاصل کردہ تجربہ اُن کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ زاہدہ حنا نے جس زمانے میں ملازمت کی اور گھر کے معاشی حالات کو سنبھالا اس وقت بہت کم عورتوں میں اتنی بھاری ذمہ داری اُٹھانے کی ہمت تھی۔ وہ بہادر اور حوصلہ مند خاتون ہیں محنت و جدوجہد نے انہیں جس زندگی کا شعور دیا وہ رومانوی نہیں بلکہ حقیقت کے قریب تھی اور یہی حقیقت پسند رویہ ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

اپنی ذات اور کہانیوں کے بارے میں زاہدہ حنا اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے'' کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

> ''عورت ہونا، کہانیاں لکھنا، اختلاف کرنا، یہ ہمارے معاشرے کی تین خرابیاں ہیں اور میں ان ہی کا مجموعہ ہوں۔ اس لیے بہت کج مج ہوں۔ بہت بے ڈھب ہوں۔ میری لکھی ہوئی کہانیاں بھی اتنی ہی کج مج اور

بے ڈھب ہیں۔ مجھے اپنے باب میں نہ کوئی خوش فہمی اور نہ ہی کوئی دعویٰ ہے، جیسے سوئی کی نوک سے گوشت میں اُتری پھانس نکالی جاتی ہے اور پھر سکھ کا سانس لیا جاتا ہے۔ ویسے ہی میں نے اپنے ضمیر اور شعور میں چھپی ہوئی پھانسوں کو قلم کی نوک سے نکالا ہے اور ورق پر رکھ دیا ہے اب اگر یہ آپ کو چبھنے لگیں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں۔'' [۳۷]

زاہدہ حنا کی تحریروں میں ان کی ذات کا عکس نمایاں ہے۔ زندگی کی کڑی دھوپ سے حاصل ہونے والا تجربہ، صدیوں کی تاریخ اور دانش کا نچوڑ مل کر زاہدہ حنا کی تحریروں کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ وہ بلا کی داستان گو ہیں۔ نہایت خوبصورت الفاظ اور لطیف پیرائے میں کھوئے انداز میں دھیمے لہجے میں بات کرتی ہیں، لیکن سیاست ایک ایسا موضوع ہے جس پر زاہدہ حنا اپنے کالموں میں اور افسانوں میں بھی گھن گرج کے ساتھ برستی نظر آتی ہیں۔ زاہدہ حنا اپنی زندگی کی داستان کو انتہائی وضعداری اور متانت سے ان چند الفاظ میں یوں بیان کرتی ہیں۔

''یہ اس لڑکی کی کہانی ہے جو ساڑھے پندرہ برس کی عمر سے زندگی کے کٹھن سفر پر نکلی۔ بڑی مشکلیں آئیں ان پر قابو بھی پایا۔ بہت سے لوگوں کا ساتھ رہا۔ لمبا اور مشکل سفر تھا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ہمت ہارنے کا مطلب ہے کہ آپ مر گئے۔ آخری سانس تک زندگی کی لڑائی لڑتی رہوں گی اور کامیابی سے زندگی کا اختتام کروں گی۔'' [۳۸]

تصانیف:

افسانے:

زاہدہ حنا کے تین افسانوی مجموعے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ا۔ قیدی سانس لیتا ہے

اس مجموعے کو روشن خیال نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے کا انتساب زاہدہ حنا نے ''جہلم کے نام'' کیا ہے جہاں ان کے پُرکھ مرزا دلدار بیگ کا دربار ہے۔ اس

مجموعے میں بارہ (۱۲) افسانے شامل ہیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں:

(i) ناگُجا آباد (ii) زیتون کی ایک شاخ
(iii) صرصرِ بےاماں کے ساتھ (iv) آنکھوں کے دیدبان
(v) پانیوں میں سراب (vi) شیریں چشموں کی تلاش
(vii) جل ہے سارا جال (viii) زرد ہوائیں، زرد آوازیں
(ix) ابنِ ایوب کا خواب (x) بود و نبود کا آشوب
(xi) رنگ تمام خوں شُد (xii) تتلیاں ڈھونڈنے والی

اس مجموعے کے اب تک تین ایڈیشن منظرِ عام پر آئے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن مکتبۂ دانیال نے ۱۹۸۴ء میں اور تیسرا ایڈیشن کتابیات پبلی کیشنز نے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا۔ انڈیا سے اس مجموعے کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں نصرت پبلی کیشنز لکھنؤ نے کی۔ اس مجموعے کے افسانے ''بود و نبود کا آشوب'' کا ترجمہ فیض احمد فیض نے "The Torture of the Be or Not to be" کے نام سے کیا ہے۔

۲۔ راہ میں اجل ہے

یہ افسانوی مجموعہ ۱۹۹۳ء میں دانیال پبلی کیشنز، کراچی نے شائع کیا۔ اس مجموعے میں چھ افسانے اور ایک مختصر ناولٹ شامل ہے۔ اس مجموعے کو دانیال پبلشرز نے ۱۹۹۵ء میں دوبارہ شائع کیا۔ انڈیا سے اس مجموعے کو تخلیق کار پبلشرز دہلی نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں موجود افسانوں کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:

(i) ساتویں رات (ii) زمیں آگ کی، آسماں آگ کا
(iii) یکے بود، یکے نہ بود (iv) جسم و زباں کی موت سے پہلے
(v) تنہائی کے مکاں میں (vi) آخری بوند کی خوشبو

۳۔ تتلیاں ڈھونڈنے والی

زاہدہ حنا کے پہلے دو افسانوی مجموعوں کے افسانوں کو ''تتلیاں ڈھونڈنے والی'' کے عنوان سے یکجا کر تخلیق کار پبلشرز، دِلی نے ۲۰۰۷ء میں اور الحمد پبلی کیشنز نے ۲۰۰۸ء میں شائع کیا۔

۴۔ رقصِ بسمل ہے

''رقصِ بسمل ہے'' زاہدہ حنا کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے کو الحمد پبلی کیشنز، لاہور نے مارچ ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔اس میں تیرہ (۱۳) افسانے شامل ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

(i) آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی (ii) پانیوں پر بہتی پناہ
(iii) معدوم ابنِ معدوم (iv) منزل ہے کہاں تیری
(v) رقصِ مقابر (vi) بہ ہر سو رقصِ بسمل بود
(vii) رانا سلیم سنگھ (viii) کم کم بہت آرام سے ہے
(ix) جاگے ہیں خواب میں (x) تنہائی کا چاہ بابل
(xi) نیند کا زرد لباس (xii) تقدیر کے زندانی
(xiii) ہوا پھر سے حکم صادر

ناولٹ:

زاہدہ حنا کا ناولٹ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' ان کے دوسرے افسانوی مجموعے ''راہ میں اجل ہے'' میں شامل تھا۔ جسے علیحدہ کتابی صورت میں انڈیا اور پاکستان سے شائع کیا گیا۔ انڈیا میں اس ناولٹ کی اشاعت دو مرتبہ ہوئی۔ پہلی دفعہ وانی پرکاش نے ہندی میں ترجمہ کرا کے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا۔ دوسری مرتبہ زبان پبلی کیشنز، دِلی نے ۲۰۱۱ء میں انگریزی ترجمہ کرا کے "All Passion Spent" کے عنوان سے شائع کیا۔ پاکستان میں اس ناولٹ کو الحمد پبلی کیشنز، لاہور نے ۲۰۱۲ء میں شائع کیا۔

مضامین:

خواتین کے مسائل پر زاہدہ حنا کے مضامین کا مجموعہ ''عورت زندگی کا زنداں'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے کے دو ایڈیشن پاکستان میں اور دو ایڈیشن ہندوستان میں تراجم کی صورت میں سامنے آ چکے ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۰۰۴ء میں شہرزاد پبلی کیشنز کراچی سے شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن سٹی بک پریس سے ۲۰۱۰ء اور اس کا تیسرا ایڈیشن الحمد پبلی کیشنز، لاہور

سے زیرِ اشاعت ہے۔ انڈیا سے اس مجموعے کو انیس امروہوی نے تخلیق کار پبلی کیشنز سے شائع کیا۔ اس کا ہندی ایڈیشن 'وانی پرکاش' نے شکیل صدیقی سے ترجمہ کرا کر شائع کیا۔

کالم:

جنگ اور امن کے موضوعات پر زاہدہ حنا کے کالموں کا پہلا مجموعہ ''اُمیدِ سحر کی بات سُنو'' کے عنوان سے پاکستان اسٹڈی سنٹر کراچی نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

تراجم:

زاہدہ حنا نے بہت سے مضامین اور کتب کے تراجم کیے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ کتابی صورت میں مندرجہ ذیل تراجم دستیاب ہیں:

۱۔ زاہدہ حنا نے گلین ڈی پیج کی عہد ساز کتاب "The None Killing Political Science" کا ترجمہ ''ہلاکت گریز عالمی سیاست'' کے عنوان سے کیا جسے فکشن ہاؤس، لاہور نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا۔

۲۔ مشہور عرب دانشور 'فاطمہ مرنیسی کی کتاب "Scheherazade Goes West" کا ترجمہ ''شہرزاد مغرب میں'' کے نام سے مشعل بکس، لاہور نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

حوالہ جات

۱۔ زاہدہ حنا: ز،ح (ابتدائیہ) ''قیدی سانس لیتا ہے''، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۳ء، ص۱۱۔

۲۔ زاہدہ حنا: ''قرۃ العین حیدر- ایسا کہاں سے لائیں'، مشمولہ ''قرۃ العین حیدر- اُردو فکشن کے تناظر میں'' (مرتبین) حسن ظہیر، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، شہاب قدوائی، پاکستان انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۹ء، ص۴۵۲۔

۳۔ ادیب سہیل: ''کہانی زاہدہ حنا کی''، فلیپ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

۴۔ راقمہ سے انٹرویو' زاہدہ حنا' بمقام شالیمار ٹاورز، لاہور بتاریخ ۲۴ مئی ۲۰۱۴ء۔

۵۔ حمرا خلیق: فلیپ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

۶۔ کنول رعنا: ''زاہدہ حنا - شخصیت و فن''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، جامشورو، جامعہ سندھ، ۱۹۹۷ء، ص۵۔

۷۔ زاہدہ حنا: ز،ح (ابتدائیہ) ''قیدی سانس لیتا ہے''، ص۱۱۔

۸۔ ''انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا''، لاہور، الفیصل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص۵۲۸۔

۹۔ بحوالہ "Life documentry of Zahida Hina on Aaj TV"، ۴ نومبر ۲۰۰۹ء۔

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ''، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص۷۱۹۔

۱۱۔ جعفر احمد، سید، ڈاکٹر: ''سر آغاز''، مشمولہ ''اُمید سحر کی بات سنو''، زاہدہ حنا، کراچی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، ۲۰۱۱ء، ص۱۳۔

۱۲۔ ''چہرہ نما'' مشمولہ طلوعِ افکار، دسمبر جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۔

۱۳۔ کنول رعنا'' زاہدہ حنا۔شخصیت وفن''، ص۱۲۔

۱۴۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، ص ۵۲۸۔

۱۵۔ فلیپ ''عورت زندگی کا زنداں''، کراچی، شہزاد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء۔

۱۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ، ایک صدی کا قصہ''، ص۱۹۷۔

۱۷۔ ارم سلیم: ''کشور ناہید اور زاہدہ حنا کے کالموں میں تانیثی شعور''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، ملتان، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۴۔

☆ زاہدہ حنا کے ڈرامے غیر مطبوعہ ہیں۔

۱۸۔ بحوالہ "Life documentry of Zahida Hina on Aaj TV"۔

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ حسینہ معین: ''رنگ لائی ہے حنا''، مشمولہ ''طلوعِ افکار'' دسمبر جنوری ۱۹۹۵ء، کراچی، ص۱۸۔

۲۱۔ زاہدہ حنا: ز، ح (ابتدائیہ) ''قیدی سانس لیتا ہے''، ص۱۲۔

۲۲۔ امتیاز احمد: ''جان ایلیا کے انشائیے''، ملتان، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء، ص۲۔

۲۳۔ راقمہ سے ٹیلی فونک گفتگو، بتاریخ ۱۶ ستمبر ۲۰۱۴ء بہ وقت ۴:۱۵۔

۲۴۔ زاہدہ حنا: (کالم) ''طاقت پرواز ہونی چاہیے'' مشمولہ: روزنامہ ایکسپریس، ملتان، ۲۲ مارچ ۲۰۰۹ء۔

۲۵۔ جعفر احمد، سید، ڈاکٹر: ''سرآغاز'' مشمولہ ''اُمیدِ سحر کی بات سنو''، ص۱۳۔

۲۶۔ زاہدہ حنا: (کالم) ''طاقتِ پرواز ہونی چاہیے''۔

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ راقمہ سے ٹیلی فونک گفتگو۔

۲۹۔ ادیب سہیل: ''کہانی زاہدہ حنا کی'' (فلیپ) ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی''

۳۰۔ راقمہ سے انٹرویو، زاہدہ حنا۔

۳۱۔ زاہدہ حنا: ''اکثر شبِ تنہائی میں'' (غیر مطبوعہ مقالہ) ''بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں''

(عالمی کانفرنس) لاہور، الحمراء، ۲۵ مئی ۲۰۱۴ء۔

☆۱ یہ غیر مطبوعہ مقالہ ضمیمہ جات میں موجود ہے۔

۳۲۔ راقمہ سے انٹرویو، زاہدہ حنا۔

۳۳۔ حمرا خلیق: (فلیپ) ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''۔

۳۴۔ عذرا لیاقت: ''بیسویں صدی کی نمائندہ افسانہ نگار خواتین (ایک تنقیدی تذکرہ)، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، ملتان، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص ۹۶۔

۳۵۔ دُردانہ جاوید، ڈاکٹر: ''پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین''، حیدرآباد، قصر الادب، ۲۰۰۲ء، ص ۹۱۔

☆۲۔ یہ مضمون اور افسانہ ضمیمہ جات میں شامل ہے۔

۳۶۔ راقمہ سے انٹرویو، زاہدہ حنا۔

۳۷۔ زاہدہ حنا: ''ز، ح (ابتدائیہ) ''قیدی سانس لیتا ہے''، ص ۱۱۔

۳۸۔ بحوالہ "Life documentry of Zahida Hina on Aaj TV"۔

باب دوم:

زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری
(فکری جائزہ)

۱۔ سیاسی شعور

۲۔ تاریخی شعور

۳۔ سماجی شعور

۴۔ نسائی اور تانیثی شعور

۵۔ فلسفیانہ شعور

۶۔ ہجرت کا کرب

زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری

(فکری جائزہ)

۸۰ء کی دہائی اُردو افسانہ میں علامتی اور تجریدی افسانے کی دہائی تھی۔ اگر چہ اِس کا آغاز ۶۵ء کے لگ بھگ ہو چکا تھا مگر اپنی شناخت ۷۵ء سے ۸۰ء تک مستحکم کرنے میں کامیاب ہوا۔ جدید اُردو افسانے نے وجودی موضوعات کو علامتی اور تجریدی انداز میں ظاہر کرنے کی روش اختیار کی اگر چہ اُسے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا مگر اس نے اپنی ڈگر نہ بدلی اور نئے نئے تجربات کو راہ دیتا رہا۔ اصل میں آٹھویں دہائی میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اُنہوں نے زندگی کے متعلق بہت سے ایسے سوالات اُٹھا دیے تھے کہ جن کو روایتی بیانیہ میں سمجھنا آسان نہیں رہا تھا۔ اِس دہائی اور اس سے کچھ دیر پہلے کے اردو افسانے میں احتجاج بھی ہے انحراف بھی، انوکھے اور نئے تجربات بھی، مختلف نقطۂ ہائے نظر بھی، مغرب کی تقلید بھی ہے اور اپنی انفرادی شناخت کی کوشش بھی جس سے اُردو افسانے میں خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ ایک حد تک تو یہ سب ضروری بھی تھا، مگر انتہا پسندانہ عناصر کی وجہ سے تخریب کا پہلو بھی دَر آیا جس نے اردو افسانے کی ساکھ کو متاثر کرنا شروع کیا۔ ایسے میں کچھ افسانہ نگار ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے جدید حسیت کو نہایت توازن سے اپنے افسانوں کا جزو بنانا شروع کیا۔ خالص تجریدیت سے گریز کیا مگر روایتی اور سپاٹ بیانیہ سے بھی رشتہ استوار نہ کیا بلکہ نیم علامتی اور تہہ دار بیانیہ کی طرز کو اپنا کر افسانے میں نئی دلکشی پیدا کر دی۔ زاہدہ حنا ایسے افسانہ نگاروں میں ہی شمار ہوتی ہیں۔ اُنہوں نے ۷۵ء کے لگ بھگ لکھنا شروع کیا مگر خود کو جدید اُردو افسانے کے منفی اثرات سے محفوظ رکھا اور کمال خوبی سے عالمی اور ملکی، سیاسی و سماجی منظر نامے کو تہہ دار بیانیہ کی صورت میں افسانوی پیرائے میں ڈھالا اُس وقت کراچی میں خاص طور پر اسد محمد خان، حسن منظر، اے خیام اور

رضیہ فصیح احمد بھی افسانہ نگاری کے میدان میں قدم جما رہے تھے اور تہہ دار بیانیہ اور نیم علامتی طرز کو رواج دے رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کہانی پن کے عنصر کو اور کرداروں کو دوبارہ اہمیت حاصل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کرداروں کا 'ہیولہ پن' غائب ہوا، لیکن اُن کی داخلی کش مکش میں اضافہ نظر آنے لگا۔ عدم تفہیم اور عدم ترسیل کی بھی حوصلہ شکنی ہوئی اور اب خیال کو اہم جانا جانے لگا۔

زاہدہ حنا نے افسانہ نگاری میں ایسی صورت کو اپنایا۔ اُن کے پاس نہ تو موضوعات کی کمی تھی نہ اظہاری سانچوں کی۔ انہوں نے رشید امجد، انور سجاد، خالدہ حسین کا راستہ اختیار نہیں کیا اور ایک الگ دبستان کی نمائندہ بن کر سامنے آئیں۔ کراچی میں اسد محمد خان تاریخی افسانے لکھ رہے تھے۔ حسن منظر اور رضیہ فصیح احمد سیاسی و معاشرتی بیانیے کو فروغ دے رہے تھے۔ زاہدہ حنا نے تاریخ اور سیاست خصوصاً عالمی سیاست کو اپنے شعور کا حصہ بنایا اور نئے سرے سے زندگی کا ادراک کیا۔

انسانیت سے محبت کے باوجود وہ کسی مخصوص نظریے کی پرچارک نہ بن سکیں۔ اس محبت کا اظہار اُنہوں نے اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنا پر کیا۔ ان کی زندگی کے متنوع تجربات ان کے عمیق مطالعے کے ساتھ مل کر افسانوں میں موضوعات کی ایک وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہیں جن میں سیاسی، سماجی، تاریخی، فلسفہ، تانیثیت اور ہجرت وغیرہ شامل ہیں۔ ان موضوعات کو زاہدہ حنا نے اِس طرح اپنے افسانوں میں سمویا ہے کہ ہر افسانہ قاری کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور فہم و ادراک کے نئے دَر وَا کرتا ہے۔

اِس باب میں اُن کے موضوعات پر تفصیلاً بحث کی جائے گی۔ حقیقت میں یہ تمام موضوعات ایک دوسرے سے اِس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ اِن کو الگ کرنا ممکن نہیں۔ اِس خطے کی تاریخ ہو یا تہذیبوں کے زوال کا نوحہ، نفسیات کی راہداریوں میں بھٹکتے ہوئے خیالات ہوں یا ناانصافیوں پر چیخ اُٹھنے والی آوازیں، ہجرت کے مصائب اور ملکوں کے درمیان کھینچی جانے والی لکیریں ہوں یا رشتوں میں پڑنے والی دراڑیں، یہ سب اُن کی تحریر میں یکجا ہو گیا ہے۔ موضوعات کی رنگا رنگی کو زاہدہ حنا صرف اپنے افسانے کی زیب و زینت کے لیے ہی استعمال نہیں کرتیں بلکہ ہنرمندی سے اِنہیں افسانوں کے قالب میں ڈھال کر قاری کے سامنے رکھ کر اُسے دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

زاہدہ حنا کے تین افسانوی مجموعے سامنے آ چکے ہیں:

۱۔ قیدی سانس لیتا ہے

۲۔ راہ میں اَجل ہے

۳۔ رقصِ بسمل ہے

اپنے پہلے افسانوی مجموعے میں زاہدہ حنا کی تحریر میں قاری کو جکڑ لینے والا سحر ملتا ہے۔ وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں اُسے اپنے ہمراہ لیے چلتی ہیں۔ منظر نگاری میں محبت کی آمیزش سے ایسا رنگ پیدا ہوا ہے کہ لگتا ہے، ہم اپنی آنکھوں سے عہدِ گزشتہ کے لوگوں، گلی محلوں، مکانوں اور مکینوں کو نہ صرف دیکھ رہے ہیں بلکہ اُن کے ساتھ سفر بھی کر رہے ہیں۔ لیکن زمانے کا مزاج وقت کے ساتھ بدلتا ہے کیونکہ دُنیا کی ہر چیز تغیر کی زَد میں ہے اور ہر عہد کا اُسلوب ہی اُس کی شناخت ہوتا ہے۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی، تاریخی محرکات ادب کی روش کو بدلتے ہیں۔ زاہدہ حنا کی تحریر میں بھی ارتقاء کا اُصول کارفرما نظر آتا ہے۔ اُن کے دوسرے اور تیسرے افسانوی مجموعوں کے موضوعات پہلے مجموعے سے یکسر تبدیل ہیں۔ مقامی اور بین الاقوامی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں نے اُن کی تحریر کو یکسر بدل دیا۔ دنیا کی نام نہاد ترقی جو اپنے جلو میں بے پناہ تباہی اور بربادی لیے ہوئے ہے اِس بربادی پر زاہدہ حنا کا قلم افسردہ نظر آتا ہے، لیکن یہ افسردگی کسی مخصوص خطے سے وابستہ نہیں۔ اُن کی تحریر کی کوئی سرحد نہیں، کوئی سفارت خانہ نہیں، زبان یا تہذیب نہیں بلکہ پوری دنیا اُن کے افسانوں میں سمٹ آئی ہے۔

زاہدہ حنا کے افسانوں کے موضوعاتی جائزے سے اُن کی تخلیقی فعالیت، سماجی بصیرت، سیاسی اور تہذیبی ادراک کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

زاہدہ حنا کا سیاسی شعور

بیسویں صدی کے آغاز تک نوآبادیاتی نظام اپنے عروج کے بعد زوال کا شکار تھا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام کو اپنی بساط سمیٹنا پڑی، لیکن اس وقت تک استحصالی اقوام اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ نوآبادیاتی نظام اپنی کلاسیکی شکل میں قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لیے انہوں نے طے کیا کہ ان اقوام کو بظاہر سیاسی آزادی دی جائے، لیکن ذہنی، فکری، سیاسی، معاشی اور ثقافتی طور پر ان کو اپنے زیرِ اثر رکھا جائے اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے برصغیر میں طبقاتی نظام کو فروغ دیا۔ جاگیرداری اور آمریت کو پروان چڑھایا۔ مقامی طور پر سرمایہ داری کو مضبوط نہیں ہونے دیا تاکہ یہ لوگ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی امریکہ کی منڈی بنے رہیں۔

سامراجیوں نے ان مقاصد کے حصول کے لیے نوآزاد ممالک میں اپنے ''وفادار'' حکمرانوں کا خوب ساتھ دیا اور ان وفاداروں نے بھی غلامی کا حق بھرپور طریقے سے ادا کیا۔ اس طرح مغرب کی حکومت برصغیر پر بالخصوص ہندوستان میں ایک نئے طریقے سے متعارف ہوئی جسے ''جدید نوآبادیات'' کہا جاتا ہے اور یہ نظام اتنا مضبوط ہے کہ یہاں کے لوگ غلامی کی ایک ایسی اَن دیکھی زنجیر میں جکڑے ہیں کہ ان کے لیے نکلنا ممکن ہی نہیں ہے۔

پاکستان کی سیاسی حالت شروع ہی سے دگرگوں رہی ہے۔ بار بار کے مارشل لاء کے نفاذ سے جمہوری کلچر کبھی نہیں پنپ سکا۔ سیاسی عدم استحکام کے نتیجے میں رشوت، سفارش، لاقانونیت، عدم تحفظ، خوف، غربت، دہشت گردی جیسے عوارض نے پاکستانی تشخص کو مسخ کر دیا ہے۔

تخلیق کار معاشرے کا اجتماعی ضمیر ہوتا ہے وہ عام افراد کی نسبت معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنی حساسیت کے سبب زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے، لیکن ہمارے حبس زدہ معاشرے میں کسی بھی قلم کار کو اجازت نہیں کہ وہ ظلم، استحصال، بدعنوانیوں کے خلاف اور عام آدمی

کے حق میں بات کر سکے۔ زاہدہ حنا معاشرے کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی جبر کے خلاف ایک باغی آواز ہے۔ زاہدہ حنا تعلیم یافتہ اور سیاسی بصیرت رکھنے والی خاتون ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بہت پختہ ہے۔ وہ عام عورتوں کی طرح رنگوں، پھولوں، خوشبوؤں پر ہی نظر نہیں رکھتیں بلکہ عالمی سیاسی منظر نامے اور اس حوالے سے پاکستانی سیاست پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ نو آبادیات کو زاہدہ حنا نے اپنی سیاسی بصیرت سے اس طرح بیان کیا ہے:

''بدیسی آقا رُخصت ہو چکے تھے اور یہ خواجہ سرا ان کی کمال نیابت کر رہے تھے یہ ان بستیوں کے فاتح تھے جن کی حفاظت ان کا روزگار تھی۔ یہ ان نہتوں کے قاتل تھے جن کا یہ نمک کھاتے تھے۔ نو آبادیات کی تجزیہ گاہ میں انہیں سکھایا گیا تھا کہ قوموں کے ساتھ زنا بالجبر کس طرح کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی قوم کو آختہ کرتا ہو تو اس کے بازو، اس کی پنڈلیاں، اس کے شانے کن مفادات کے تسموں سے باندھے جاتے ہیں۔''[۱]

زاہدہ حنا کے مزاج میں بغاوت اور بے خوفی کا عنصر بہت زیادہ ہے اور مزاج کی یہ خاصیت اُن کی تحریروں میں نمایاں ہے۔ اُنہوں نے ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں لوگ ظلم کے خلاف آواز بُلند کرنے سے گھبراتے ہیں سیاسی حقائق و واقعات کی سچی اور حقیقی تصاویر کو افسانوں میں پیش کر کے لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ضیاء الحق کا مارشل لاء ادیبوں اور شاعروں کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اُس دور میں تحریر و تقریر پر ہر طرح کی پابندی تھی۔ تخلیق کار صرف اور صرف حکمرانوں کی تعریف اور خوشامد کرنے کے لیے آزاد تھے، لیکن زاہدہ حنا نے اس دور میں اپنے قلم، اپنی آواز اور عمل کے ذریعے بغاوت کی۔ کیونکہ وہ اس بات کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اہلِ قلم ہی وہ لوگ ہیں جو ٹھہرے ہوئے معاشرے میں ہلچل اور تبدیلی لاتے ہیں اور حاکمِ وقت سے انسانوں کی بھلائی اور فلاح کے لیے سوال کرتے ہیں۔ زاہدہ حنا اس سوال کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ''جاگے ہیں خواب میں'' اس کی اہمیت کو یوں بیان کرتی ہیں:

''گھنٹوں، دِنوں یا صدیوں بعد اس کا ذہن کوئی سوال قائم کر سکا تھا وہ

تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ ابھی وہ زندہ تھا گردن پر رکھے ہوئے سر میں ذہن ابھی
دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ سکتا تھا ڈھول کی آواز پور پور میں چیخ رہی تھی پھر
بھی ذہن سوال کر سکتا تھا
سوال کر سکتا تھا؟

"To Question"

ذہن کا وہ ستون جس پر انسان اور انسانیت قائم ہے۔'' [۲]

زاہدہ حنا کو احساس ہے کہ اپنے حق کے لیے سوال حکمرانوں سے ضرور کرنا چاہیے۔
پاکستان میں ۷۰ء کی دہائی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے کیونکہ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ نے تخلیقی ذہن کو نئے المیے سے دوچار کیا۔ اسی دہائی کا دوسرا بڑا واقعہ ۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق کا مارشل لاء ہے جس نے ادب کو بہت زیادہ متاثر کیا کیونکہ نہ صرف بنیادی انسانی حقوق معطل کر دیے گئے بلکہ آزادیِ اظہار پر پابندی کی وجہ سے تخلیق کار طبقہ شدید اضطراب کا شکار ہوا۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے ادیبوں کی طرف سے نئے وسیلے تراشے گئے اور اُنھوں نے علامتی اور تجریدی انداز میں مزاحمتی ادب تخلیق کیا۔ زاہدہ حنا نے بہت بے خوفی سے اس سیاہ عہد کے خلاف تحریری ثبوت قاری کے لیے محفوظ کیے۔

مزاحمت ہمیشہ سے ہی ادب کا حصہ رہی ہے۔ ادیب ہر دور میں ظلم کے خلاف مزاحمت کرتا رہا ہے، لیکن ۸۰ء کی دہائی کی مزاحمت سیاسی جبر کے خلاف ایک عوامی ردِعمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ زمانہ پاکستان میں فکری انحطاط کا زمانہ ہے۔ سیاسی عمل کو روکنے کے لیے مذہبی تشدد اور گروہ بندی کو منظم طور پر فروغ دیا گیا۔ مذہب کی روح کی بجائے ظاہری رسومات پر زور دیا گیا۔ یوں پاکستانی معاشرے کو ایک بند معاشرے میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس دور میں جتنی بھی کہانیاں لکھی گئیں ان کا موضوع کسی نہ کسی حوالے سے سیاسی جبر و تشدد کا اظہار ہے۔ پانیوں پر بہتی پناہ، بود و نبود کا آشوب، تتلیاں ڈھونڈنے والی، آخری بوند کی خوشبو، ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران لکھے گئے افسانے ہیں [۳] میں زاہدہ حنا علامتی انداز میں سراپا احتجاج نظر آتی ہیں۔ ان افسانوں میں اپنے عہد کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے سیاسی باغی، جرنلسٹ کے کردار نظر آتے ہیں۔ جن کے ذریعے نہ صرف بھیانک آشوب برہنہ ہو کر سامنے آ گیا ہے بلکہ آج کے انسان کا

جرأت مندانہ انتخاب بھی ظلم کے سامنے آ گیا ہے کہ وہ ظلم و جبر کے مقابلے میں ضمیر کی نمائندگی ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔ زاہدہ حنا نے ٹارچر سیلوں، بندی خانوں، اذیت گاہوں اور عقوبت صراؤں کی بھیانک فضاؤں کو نیم وا انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ قاری ذہنی و جذباتی صدمے اور شاک سے دوچار ہوتا ہے۔

آج کا دور صرف بحران کی تاریخ ہی قدم قدم پر رقم نہیں کر رہا بلکہ حادثات کو معمول بنا کر گزر رہا ہے۔ اَب سانحات اپنی Shock کرنے کی صلاحیت کسی حد تک کھو بیٹھے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالات کی سنگینی نے ہمیں بے حس بنا دیا ہے۔ اس کے مقابل آج کے دور کی سب سے بڑی حقیقت بغاوت کی آرزومندی ہے اور یہ شوقِ بغاوت ہی فنکاروں کی دھڑکنوں میں بستا ہے اور نیم جاں معاشرے کے لیے زندگی کی اُمید ہے۔ آج کے دور کی کہانی کو سمجھنے کے لیے حقیقت اور خواب کی آمیزش کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ایسے دور میں جب دنیا کی سپر پاورز دُنیا کو تباہ کرنے پر تُلی ہوئی ہیں تو تیسری دنیا کا فنکار اپنی کہانی میں اِس دور کے ظلم، سفاکی، بے حسی اور بے زاری کو نہ صرف بیان کرتا ہے بلکہ اس سے نجات پانے کے لیے انسان کے پاس واحد طریقہ بغاوت ہے جو تبدیلی کا ضامن ہے اور تبدیلی کی اِسی ضمانت کو زاہدہ حنا اپنے مختلف افسانوں میں بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانے ''پانیوں پر بہتی پناہ'' میں بنگلہ دیش کی ادیبہ تسلیمہ نسرین کو موضوع بنایا ہے جو معاشرے کے مروجہ اُصول وروایات کے خلاف آواز اُٹھانے کے جُرم میں معاشرے کے ٹھیکیداروں کی طرف سے کڑی تنقید کا نشانہ بنیں اور قاتلانہ حملہ بھی ان پر کیا گیا لیکن انہوں نے اپنی روش نہیں بدلی اسی کردار کے حوالے سے زاہدہ حنا اہلِ قلم کو پیغام دیتی ہے کہ

> ''کیسی لکھنے والی ہو کہ 'مردہ باد ___ مُردہ باد' سے ڈر گئیں۔ بھئے سے بچنا چاہتی ہو تو لکھو اور خوب لکھو۔'' [۴]

ان کا ماننا ہے کہ بڑی طاقت کے خلاف آواز قلم اور زباں دونوں کے ذریعے اُٹھائی چاہیے باغی آواز اپنا آپ منوالیتی ہے اور معاشروں کو ایسی آوازیں اُمید، حوصلہ اور آس دلاتی ہیں کہ نیا سورج طلوع ہوگا کیونکہ فتح آخر کار حق اور سچ کی ہی ہوتی ہے۔

آج طاقتور مغربی ممالک جنہوں نے منڈیوں کی تلاش میں یورپ، ایشیاء، افریقہ،

لاطینی امریکہ اور دیگر ممالک کا رُخ کیا۔ ان ممالک کے کمزور اور نہتے افراد کو مہذب، تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ بنانے کے نام پر لاکھوں افراد کا خون بہا رہے ہیں۔ ان ممالک کے وسائل پر قبضہ کرنے کے یہ بہانے جمہوریت، لبرل ازم اور انسان دوستی کے نام کی صورت میں سامنے آئے۔ آج اکیسویں صدی میں کہ جہاں دُنیا ترقی کی انتہائی صورت دیکھ چکی ہے۔ اس دور میں انسان دوستی، جمہوریت اور لبرل ازم کا نعرہ لگانے والوں کا انتہائی بھیانک روپ جنگ کی صورت میں سامنے آیا ہے اور اس روپ کی تصویر کشی زاہدہ حنا اپنے افسانوں میں بخوبی کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ جنگ کے سخت خلاف ہیں کیونکہ جنگ اپنے جلو میں بہت زیادہ تباہی اور بربادی لاتی ہے جو کسی مخصوص نسل، قوم یا مذہب کو نہیں دیکھتی بلکہ ایک دُنیا اُس کا نوالہ بن جاتی ہے۔ اپنے افسانے ''جاگے ہیں خواب میں'' میں لکھتی ہیں کہ

> ''تاریخ کے تنور میں قومیں اور نسلیں دم پخت، موت کی ضیافت کے لیے دستر خوان چُنا ہوا۔ آیئے صاحبان، یہ جاپانی اور کوریائی ذائقہ ہے لیجیے یہ رہا ویت نامی شاشلک، ادھر جرمن اور پولش یہودیوں کا باربی کیو ہے۔ افغان یخنی، فلسطینی تکے اور عراقی کباب سب کچھ حاضر ہے حضور، عالی جاہ یہ صرف پچپن ساٹھ برس کی جنگوں کا ثمر ہے۔'' [۵]

رقصِ مقابر، بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود، گُم گُم بہت آرام سے ہے، نیند کا زرد لباس، زیتون کی ایک شاخ میں زاہدہ حنا نے جنگ سے ہونے والی تباہی کو موضوع بنایا اور امن کی آشا کرتے ہوئے ان جنگ زدہ لوگوں کی حسرتوں کو دکھایا ہے کہ کیسے وہ امن کے لیے ترستے ہیں اور پُرسکون زندگی کا خواب لیے جی رہے ہیں۔

ادیب خواہ کسی بھی خطے کا ہو جنگ کے لیے بے انتہا ناپسندیدگی اپنے دل میں رکھتا ہے کیونکہ جنگ بربادی اور تباہی کا بہت طویل چلنے والا سلسلہ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ زاہدہ حنا اور جاپانی ناول نگار ساکائے سوبوئی ☆ میں نظریاتی سطح پر مماثلت نظر آتی ہے کہ جنگ کی خاطر زندہ لوگوں کو قربان کرنا بہت غلط ہے۔ دونوں تخلیق کار جنگ اور امن کے دنوں کا فرق اپنی تحریروں میں پُر اثر طور پر بیان کرتی ہیں۔ ''چوبیس آنکھیں'' کا پیش لفظ لکھتے ہوئے اس فرق کو بہت خوبصورتی سے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ

''کسی دانا نے امن اور جنگ کا فرق اس طرح بیان کیا تھا کہ امن کے دِنوں میں اپنی طبعی عمر گزار کر مرنے والے باپوں کو ان کے بیٹے گورستان تک پہنچاتے ہیں جبکہ جنگ کے زمانے میں بوڑھے باپوں کو اپنے جوان بیٹوں کی میتوں کا بوجھا اپنے کاندھوں پر اُٹھانا پڑتا ہے۔''[٦]

زاہدہ حنا جنگ کی تباہی اور ہولنا کی بیان کرنے سے زیادہ توجہ اس بات پر دیتی ہیں کہ جنگ کی مہیب اور غیر انسانی وحشت انسانی وجودوں کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے کس طرح لوگوں کا رُخ زندگی کی رنگینیوں کی طرف سے موڑ کر ان کو جنگ کے دہشت ناک اور سفاک منظر نامے کا حصہ بنادیا جاتا ہے جس میں ہر طرف موت ہی رقص کرتی ہے۔

زاہدہ حنا کسی خاص مُلک، قوم یا خطے کی جنگ کو بیان نہیں کرتیں بلکہ پوری دُنیا جہاں بھی جنگ ہورہی ہے۔ اس کی ہولنا کی کو موضوع بناتی ہیں۔ جاپان، ایران، فلسطین، افغانستان، عراق، رنگون اور ان ممالک کے ساتھ ساتھ پاکستان میں جاری جنگ پر زاہدہ حنا قلم اُٹھاتی اور اس کے خلاف آواز بُلند کرتی ہیں کیونکہ جنگ کا نقصان صرف اور صرف عام آدمی برداشت کرتا ہے وہ مقتدر طبقہ جو جنگ کا شاہی فرمان جاری کرتا ہے۔ اس تباہی سے بالکل محفوظ رہتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

جنگ ہتھیاروں کی ہو، اعصاب کی، سرد ہو یا جوہری، علاقائی ہو یا عالمی اس میں ایک خصوصیت ہمیشہ مشترک رہی ہے کہ عوام کا بالعموم اس سے بلاواسطہ تعلق نہیں ہوتا۔ امن اور جنگ کا اختیار چند بڑوں کو ہوتا ہے۔ حکومت جنگ چھیڑنے سے پہلے عوام کی رائے نہیں دریافت کرتی۔ اس لیے بعض صورتوں میں عوام حکومت کی وجہ کو اپنے لیے درست تسلیم نہیں کرتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چند استثنائی صورتوں سے قطع نظر عوام کا جنگ سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا کہ برسرِ اقتدار فرد (یا افراد) کی اَنا، ہوس، یا ذہنی بوالعجبیوں کا ہوتا ہے۔''[٧]

تمام جنگ زدہ علاقوں کی مشترک صفت جو زاہدہ حنا نے اپنے وسیع مطالعے کے نتیجے میں تلاش کی ہے وہ یہ کہ یہ ممالک اندرونی اور بیرونی دونوں حوالوں سے انتشار کا شکار ہیں۔ دو

مہاذوں پر لڑ رہے ہیں یعنی مرنے اور مارنے والے ایک ہی ہیں۔ لکھتی ہیں:

''لیکن دِلّی اور بغداد کے لوٹنے والے نصاریٰ کو کیا کہیے۔ بغداد کے محلے کرخ میں قتلِ عام کرنے والے کلمہ گو تھے۔ کلمہ گو نادر شاہ دُرانی اور احمد شاہ ابدالی نے دِلّی کو جی بھر کر لوٹا۔ لالہ دانیال کو جی بھر کر ہنسی آئی۔ کلمہ گو کُردوں کے لیے مسٹرڈ گیس، کلمہ گو ایرانی اپنے ہی پیشواؤں کے فتوؤں سے قتل ہوئے۔ کلمہ گو بنگالیوں کے سروں کی کھیتی کلمہ گو پاکستانی مجاہدین نے کاٹی۔ کلمہ گو فلسطینی دریائے اُردن کے کنارے، کلمہ گو جالندھری جرنیل کے ہاتھوں ختم ہو رہے تھے۔ دل تو ایوبی ہوا، آنکھیں ہوئیں یعقوبیاں۔'' [۸]

گُم گُم بہت آرام سے ہے، رقصِ مقابر، جاگے ہیں خواب میں، بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود، نیند کا زرد لباس، میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔

زاہدہ حنا پوری دُنیا میں جاں کہیں ظلم ہوتا ہے اس کے خلاف آواز اُٹھاتی ہیں کیونکہ وہ ان تمام لوگوں سے درد کے رشتے سے منسلک ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے موضوعات میں آفاقیت کا رنگ نمایاں ہے۔ وہ بلا تخصیص رنگ و مذہب انسانیت کے لیے نوحہ کناں نظر آتی ہیں۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی رقمطراز ہیں:

''دُنیا میں سب امریکی ہیں، فرنگی ہیں، ہندوستانی، پاکستانی یا کچھ اور۔ آدم کی اولاد کوئی نہیں۔ زاہدہ کا یہی غم ہے اور جب یہ غم لمحۂ غم بن کر تیرتا ہے تو مرد اور عورت کا فرق ختم ہو جاتا ہے، سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں۔'' [۹]

اور آدم کی اولاد کی یہی محبت طالبان جیسے طبقے کو بھی زاہدہ حنا کے قریب لے آتی ہے۔ طالبان ہمارے معاشرے کا ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہر کوئی نفرت اور لعنتوں کے تیر برساتا نظر آتا ہے، لیکن زاہدہ حنا کا چیزوں کو دیکھنے کا نقطۂ نظر دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ اس طبقے کی سفاکی اور بے رحمی کے اسباب کا کھوج لگاتی اور اپنے افسانوں میں بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ ان نفسیاتی اسباب کا مطالعہ کرتی ہیں جس کے سبب امن کی بجائے نفرت اور بربادی کا زہر ان لوگوں کی رَگوں میں دوڑ رہا ہے۔ اپنے افسانے ''گُم گُم بہت آرام سے ہے'' میں افغانستان کے حوالے

سے اپنا نقطہ نظر یوں پیش کرتی ہیں کہ

> ''دُنیا طالبان کو بُرا بھلا کہتی ہے۔ میں بھی یہاں آئی تو ان کے لیے میرے دل میں غصہ اور نفرت تھی، لیکن یہاں رہ کر وہ میری سمجھ میں آ گئے۔ کسی غریب اور بنجر ملک کے بچوں سے جب ان کا بچپن چھین لیا جائے۔ جنہیں بڑی بہنوں نے اُنگلی تھام کر بچ بچ کر چلایا نہ ہو۔ اُن سے آنکھ مچولی نہ کھیلی ہو۔ پھر وہاں سے طالبان ہی اُٹھتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں عورتوں کے نام سے۔''[۱۰]

یہی معصوم اور کچے ذہنوں کے بچے جب اپنے مفادات کے لیے کام کرنے والوں کے ہتھے چڑھتے ہیں تو انتہائی وحشی انسانوں کی صورت میں ''طالبان'' کے نام سے سامنے آتے ہیں جن کے اندر صرف اور صرف دُنیا کو تہس نہس کرنے کا جنون ہوتا ہے اور اگر ان جنونیوں کو حکومت کرنے کا موقع ملے تو مذہب کی آڑ میں پوری دُنیا کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ ''غلام عباس'' اُردو ادب میں بہت بڑے نام کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت عرصہ پہلے اپنے ناولٹ ''روشنی کی رفتار'' میں اس موضوع کو بیان کیا تھا کہ یہ لوگ اگر حکومت میں آ گئے تو چاند پر پہنچ جانے والے انسانوں کو مذہب کے نام پر دوبارہ غاروں کی زندگی گزارنے تک لے جائیں گے اور یہی بات زاہدہ حنا کو پریشانی میں مبتلا کرتی ہے اور وہ اِس کے سدِ باب پر زور دیتی ہیں۔ رقصِ مقابر، نیند کا زرد لباس، تقدیر کے زندانی میں یہی بات بیان کرتی ہیں۔

ادیب جس معاشرے میں زندگی گزارتا ہے وہ اپنے ماحول و تجربات سے کہانیاں لیتا ہے۔ اس کے یہ تجربات ارضی اور مقامی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہیں نہ کہیں پورے عالمی منظرنامے سے جُڑ جاتے ہیں۔ زاہدہ حنا عالمی سیاسی منظرنامے پر گہری نگاہ رکھنے والی خاتون ہیں۔ وہ عالمی منظرنامے کے حوالے سے پاکستان کے سیاسی حالات پر غور کرتی اور پھر اپنے نتائج کو تحریروں کا حصہ بناتی ہیں۔ ان کے افسانے ''زیتون کی ایک شاخ'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ عام پاکستانی شہری ہو یا امریکہ جیسی سپر پاور کا باشندہ ہر کوئی امن کے ساتھ پُرسکون طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے، لیکن دنیا پر حکمرانی کے خواہش مند حکمران لوگوں کے جذبات واحساسات کو اہمیت نہیں دیتے۔ جنگ اور خون سے نفرت کرنے والے امریکی سپاہی ایڈگر کے

خیالات یوں سامنے آتے ہیں:

''میں جنگ سے نفرت کرتا تھا اس کے باوجود مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ویت نام جانے سے انکار کر دوں اور دوسروں کے استہزا اور تمسخر کا نشانہ بنوں اور سرکاری دباؤ برداشت کروں۔ میں بہت بزدل ہوں محض خواب دیکھنے والا ایک سست الوجود انسان اور کچھ بھی نہیں۔[۱۱]

''پھانسی'' ایک ایسی سزا ہے جو انتہائی قابلِ مذمت ہے جس میں انتہائی بے رحمی سے ایک انسان کو رسی کے ذریعے زندگی کی رُونقوں سے یک لخت ہی جُدا کر کے موت کے مہیب اندھیروں میں اُتار دیا جاتا ہے۔زاہدہ حنا ایسے ظلم کو انتہائی ناپسند کرتی ہیں کیونکہ سزا کے اسباب پر توجہ دی جاتی ہے، لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس ایک انسان سے کتنی انسانی زندگیاں جڑی ہوئی ہیں۔مختلف ممالک میں اس سزا کے خلاف آواز اُٹھائی جا رہی ہے۔زاہدہ حنا بھی اس کو ناپسند کرتی ہیں۔''تتلیاں ڈھونڈنے والی'' میں نرجس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے اور آخر وقت کی منظر کشی ملاحظہ کریں:

''آخری ملاقات کا وقت ختم ہوا تو اماں غش کھا گئیں۔ بھیا سلاخوں سے چمٹ گیا وہ اس کے ہاتھوں کو پیار کر رہا تھا۔اس کے بالوں کو چھو رہا تھا پھر وہ لوگ چلے گئے، 'نہیں' وہ لوگ گئے نہیں لے جائے گئے۔نرجس کا کیسا جی چاہتا تھا کہ ایک بار، آخری بار بھیا کو سینے سے لگا لے لیکن یہ ممکن نہ تھا۔جیل کے آداب انسانوں نے بنائے تھے۔ان سے انسانی رشتوں اور جذبوں کا خیال لاحاصل تھا۔''[۱۲]

رشتوں کی جس نزاکت کو زاہدہ حنا نے اپنے اس افسانے میں بیان کیا ہے۔ یہ کسی خاص علاقے سے مخصوص نہیں بلکہ آفاقی ہیں۔

۱۹۴۷ء ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا سال تھا جس میں بظاہر ہم آزاد ہو گئے، لیکن حقیقت میں یہ آزادی نہیں غلامی کی مختلف شکل تھی۔متحدہ ہندوستان کی اقوام بظاہر آزاد ہو کر آزاد ممالک کی شہری کہلائیں، لیکن حقیقت میں ان کو آپس میں لڑانے کے لیے تعصب کو ہوا دی گئی۔نئی ریاستوں میں انسان دوستی اور لبرل ازم کی بجائے مذہبی انتہا پسندی اور تہذیبی نرگسیت کو فروغ دیا

گیا۔ اس لیے مذہب کے نام پر ان دونوں ممالک میں انتہائی اقدام اُٹھائے جا رہے ہیں۔ وہ اقوام جو ہزار سال تک آپس میں مِل جُل کر رہیں۔ جن کی تاریخ، تہذیب، تمدن آپس میں اس طرح ملے ہیں کہ ان کو جُدا کرنا ممکن نہیں وہی ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے اور وجہ 'ہم مذہب' نہ ہونا ہے۔ زاہدہ حنا ذات، پات، رنگ، نسل، مذہب اور طبقاتی تفاوت کی قائل نہیں بلکہ انسانی آزادی اور مساوات کی قائل ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب نہیں انسان اہم ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے نہ کہ مذہب کے نام پر ہزاروں بے گناہ افراد کا قتل کر کے خود کو جنت کا حقدار ثابت کریں۔ منزل ہے کہاں تیری، بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود، یکے بود یکے نہ بود، رقص مقابر میں یہی بے تعصب نقطہ نظر ملتا ہے۔

قوم اور مذہب پرستی کا رُجحان جب غالب آتا ہے تو انسان صحیح اور غلط کی تمیز بھول کر صرف اور صرف 'اپنے اور پرائے' ہم اور وہ کے دائروں میں خود کو قید کر لیتا ہے۔ اس حوالے سے مشہور مصنفہ اُرن دھتی رائے لکھتی ہیں:

> ''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں جتنا قتل و غارت کسی ایک یا دوسری طرح کی قوم پرستی کے سبب ہوا ہے وہ کسی اور بنیاد پر نہیں ہوا۔ قومی پرچم ایک ایسا رنگین کپڑا ہے جس میں حکومتیں لوگوں کے ذہن لپیٹ کر انہیں تنگ نظر بنا دیتی ہیں یا پھر ان کی میتوں کو ملفوف کر کے تکفین و تدفین کی رُسومات ادا کرتی ہیں۔'' [۱۳]

اسی طرح کی قوم پرستی اور تعصب کو ہم نے ۱۹۷۱ء میں دیکھا۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کا قیام پاکستانی سیاست کا اہم ترین موڑ ہے۔ تقسیمِ ہندوستان کے کچھ ہی عرصے بعد حکمرانوں کی سیاسی کارگزاریوں کے باعث مغربی اور مشرقی پاکستان کی عوام میں ایک دوسرے کے لیے شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ مغربی پاکستان میں بنگالیوں کے خلاف حکمرانوں کی پیدا کردہ نفرت کا رنگ زاہدہ حنا اپنے افسانے 'ہوا پھر سے حکم صادر' میں یوں دکھاتی ہیں:

> ''دماغ خراب ہوا ہے تمہارا؟ یہ کالے ٹھنگنے ہم پر حکومت کریں گے؟ ہم ان مردود بنگالیوں کے لیے احتجاج کریں گے؟ جلوس نکالیں گے؟ انہیں چُن چُن کر قتل کر دینا چاہیے کُتے، نمک حرام، کھاتے پاکستان کا اور گاتے

ہندوستان کا ہیں۔'' [۱۴]

زاہدہ حنا پاکستان میں موجود اقلیتوں کے حق کے لیے بھی آواز اُٹھاتی ہیں۔ان کے نزدیک یہ افراد زیادہ توجہ اور ہمدردی کے مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے علاقے اپنے مُلک کو چھوڑنے کا گناہ نہیں کیا۔ یہ اپنی زمین سے جڑے ہوئے ہیں، لیکن ہمارے ہاں اقلیتوں کو خوار کرنا، ان پر ظلم کرنا کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی کیونکہ ان کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ وہ احتجاج ہی نہیں کر سکتے اس لیے ہمارے حبس زدہ معاشرے میں ان کو انسان نہ سمجھنا ثواب کی بات سمجھی جاتی ہے۔

اقلیتوں کے بارے میں زاہدہ حنا کا افسانہ ''بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود'' کمال مہارت اور جرأت مندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ہمارے معاشرے میں مذہبی و ثقافتی سطح پر اقلیتوں پر گزرنے والے مظالم کی داستان کو بیان کرتا ہے۔زاہدہ حنا بتاتی ہیں کہ ایک ایسا معاشرہ جو خود کو عدل، انصاف، مساوات، شرافت اور رواداری کی اسلامی روایات کا پاسدار بتاتا ہے اُس میں اقلیتوں کو زندہ رہنے کے لیے کن کن تکالیف و مصائب کو جھیلنا پڑتا ہے اور ان اقلیتوں کو زندہ رہنا تو دُور کی بات ہے مارنے کے طریقے بھی ہمارے ہاں مختلف ہیں۔ ''بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود'' میں لکھتی ہیں:

> ''تم سے کس نے کہا تھا کہ بہاریوں، احمدیوں اور عیسائیوں کا احوال جاننے کے لیے تُم یہاں چلی آؤ۔ ایک بات سمجھ لو کہ اگر شہر کے سپریمو مجھے غدار کہہ کر ماریں گے تو تم ___ تمہارا شمار کافروں اور مرتدوں میں ہوگا اور کافروں اور مردُودُوں کو قتل کرنے والے قبیلے دوسرے ہیں ___ کافروں کو گولی نہیں ماری جاتی اُنہیں کُترا جاتا ہے ___ مُرتد اگر کلمے کا وِرد کر رہے ہوں تو ان کی زبان کاٹ لی جاتی ہے ___ ناپاک زبان پر ہمارا کلمہ آیا تو کیوں آیا ___'' [۱۵]

خانم خجستہ سوا کروڑ کی آبادی پر مشتمل کراچی شہر میں صرف نو سو بہائی نفوس پر مشتمل اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والی وہ تنہا اور محنتی و جفاکش خاتون ہے جو ناممکنات کے مقابل زندہ رہنے کا ہُنر جانتی ہیں۔ اِسی شہر میں رہنے والا نجیب جو فوٹو گرافر ہے اور آشوبِ شہر کی شہادتوں

کو کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کر لینے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کی بہن ناہید نجف جو امریکن یونیورسٹی میں مذہبی اقلیتوں کی حالت پر ریسرچ کرتے ہوئے اُن کے غم میں یوں نڈھال ہے کہ

> ''خدیجہ اور فاطمہ اور عائشہ اور سکینہ اگر آرام سے تھیں تو اِس کے لیے کہ وہ اکثریت کا حصہ تھیں اور الزبتھ مسیح، ڈیانا مسیح اور رادھا اور سیتا اگر سمٹ کر چلتی تھیں تو اس کے لیے کہ وہ اور اُن کا گروہ آٹے میں نمک کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اپنے اپنے طریقوں سے زندگی بسر کرتے ہوئے، سہمے ہوئے یہ لوگ اور اِن پر نرغہ کرتے ہوئے اُنھی ایسے آدم زاد، مٹی کے اِن پتلوں کے وجود میں درندے غراتے تھے، مُردار خور پرندے اپنے پنکھ پھڑ پھڑاتے تھے۔'' [۱۶]

زاہدہ حنا نے کمال مہارت سے مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ہونے والی منافرت، ظلم و ناانصافی کے ساتھ بہائیوں کی حالتِ زار کا نہایت موثر انداز میں نقشہ کھینچ کر اِس اقلیتی فرقے سے یکجہتی کا ثبوت دیا ہے۔۔

اَرُن دھتی رائے جو ہندوستان کی بہت بے خوف اور نڈر ادیبہ ہیں اور زاہدہ حنا کے موضوعات میں کسی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے۔ دونوں اپنے ممالک کی اقلیتوں کے حق کے لیے احتجاج کرتی ہیں۔ جب گجرات میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو ارن دھتی رائے نے اپنے یہاں کی مذہبی جنونیت کو تنقید کا یوں نشانہ بنایا۔

> ''اس وقت بھارتی حکومت کی دومنہہ فتنہ گری دوطرفہ ایکشن لینے میں مصروف ہے ایک بازو ہندوستان کو قسطوں میں فروخت کیے جارہا ہے تو دوسرا ایک شوریدہ کورس کی لے پر ہندو قوم پرستی اور مذہبی جنونیت کے ترانے گارہا ہے۔ یہی وہ گروہ ہے جو جوہری تجربات میں مصروف ہے۔ تاریخ کی کتابوں کو اپنے مفادات کے تابع کررہا ہے۔ کلیساؤں کو نذرِ آتش اور مساجد کو مسمار کررہا ہے۔ سنسر شپ، مشتبہ نگرانیاں، شہری آزادیوں اور انسانی حقوق کو معطل کرنا اس بات کی قطع بُرید کرنا کہ کون ہندوستان کا اصل شہری ہے اور کون نہیں اور بالخصوص اقلیتوں کے ساتھ یہ

برتاؤ ایک عام حقیقت بن چکی ہے۔'' [۱۷]

پوری دنیا میں تخلیق کار ہی وہ لوگ ہیں جو صرف اور صرف انسانیت کی بقاء کے لیے اپنے قلم سے جنگ لڑ رہے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک کائنات کی سب سے حسین اور اہم چیز انسان ہے۔ اگر یہ ہی نہ ہو تو مذہب کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

زاہدہ حنا آج کے عہد کی باشعور صحافی اور قلم کار ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بہت پختہ ہے۔ وہ دنیا کو تقسیم کرنے والوں کی حکمتِ عملی سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کو بڑی ہمت اور جرأت کے ساتھ اپنی تحریروں میں بیان بھی کرتی ہیں۔ وہ نہ صرف استحصال زدہ لوگوں سے ہمدردی رکھتی ہیں بلکہ ان معاشروں کو پس ماندہ رکھنے والے عوامل پر بھی غور کرتی ہیں۔ طالبان کو تنقید کا نشانہ بناتی اور ساتھ ہی ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے والوں کو بھی بے نقاب کرتی ہیں۔ اظہار پر لگنے والی قدغنوں کے خلاف آواز اُٹھاتی ہیں۔

زاہدہ حنا کا ملکی و عالمی سیاست کا وسیع مطالعہ ہے۔ وہ پوری دُنیا پر نظر رکھے ہوئے ہیں اس حوالے سے وہ پاکستان کی سیاست پر پڑنے والے اثرات کا مطالعہ کرتی ہیں، کیونکہ آج دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ کسی بھی ملک میں آنے والی تبدیلی اس کی ذاتی نہیں ہوتی بلکہ پوری دنیا پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس گلوبلائزیشن کا صرف اُردو ادب ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک کے ادیب بھی اپنی تحریروں میں ذکر کرتے ہیں مثلاً چیکوسلواکیہ کے مشہور ادیب میلان کنڈیرا نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

> ''اچانک، ہماری صدی میں، دنیا ہمارے چاروں طرف سے بند ہونے لگی ہے۔ دنیا کی دام میں تبدیلی کا فیصلہ کُن واقعہ یقیناً ۱۹۱۴ء کی جنگ تھا جسے (تاریخ میں پہلی بار) عالمی جنگ کہا جاتا ہے۔ 'عالمی' غلط طور پر۔ اس میں صرف یورپ ہی ملوث تھا اور وہ بھی پورا یورپ نہیں۔ تاہم اسم صفت 'عالمی' دہشت کے احساس کو کچھ اور زیادہ بلاغت سے بیان کرتا ہے کہ آئندہ سے کرۂ ارض پر واضح ہونے والی کوئی بات محض ایک مقامی معاملہ نہیں ہوگی، کہ تمام واہیات کا سروکار سارے عالم سے ہوگا اور نتیجتاً ہم خارجی حالات سے اور بھی زیادہ متعین ہوں گے۔'' [۱۸]

بلاشبہ زاہدہ حنا ایک عمدہ تخلیق کار ہیں لیکن تخلیق کے چند اپنے تقاضے ہوتے ہیں جو گہرائی، معنویت، تہہ داری افسانے کی ضرورت ہے وہ حسن زاہدہ حنا کے آخری افسانوی مجموعے ''رقصِ بسمل ہے'' میں کسی حد تک ماند پڑ گیا ہے۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کو ہی بیان کرنے پر زور دیتی اور افسانے میں کہانی پن کو کسی حد تک نظرانداز کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد کی رائے اہم ہے کہ

> ''کہیں کہیں ان کے افسانے میں ان کے بیانیے کی یکسانیت، ایک نہ ایک کردار کی موت، کہانی کو فیچر بنانے والی کرافٹ، تخلیق کار سے اور ریاضت کا تقاضا کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔'' [۱۹]

زاہدہ حنا کا تاریخی شعور

زاہدہ حنا کا نام اُردو ادب میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ وہ ایک طویل عرصے سے لکھنے کے عمل سے جُڑی ہوئی ہیں اور قلم کی حُرمت کا حق ادا کر رہی ہیں۔ ان کے افسانوں میں تاریخ نگار کا جو روپ سامنے آتا ہے وہ اہم بھی ہے اور قابلِ تعریف بھی۔ ان کے افسانوی مجموعے اپنی ترتیب اور پیش کش کے اعتبار سے اپنا ایک مخصوص مزاج و انداز رکھتے ہیں۔ ان کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور اس کا اندازہ جا بجا ہوتا ہے۔ وہ اس وسیع مطالعے کو اپنی تخلیق کا حصہ اس طرح بناتی ہیں کہ افسانہ صرف تاریخی معلومات ہی معلوم نہ ہو بلکہ تخلیقی عمل کے ساتھ مل کر اس کی معنویت میں گہرائی پیدا کرے۔

تاریخ ہمیشہ حکمرانوں اور مقتدر طبقے کی منشاء کے مطابق لکھی گئی اس لیے تاریخ کی کتب میں ہمیشہ مقتدر طبقے کی تعریفیں ہی ملتی ہیں جن میں سب سے اہم کردار مذہب کا ہے۔ مذہب کے نام پر ان لوگوں کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر تعریفوں کے ساتھ بیان کیا گیا، لیکن زاہدہ حنا کبھی بھی تاریخ کا سُراغ تاریخی کُتب سے نہیں لگاتیں، ان کے نزدیک اصل تاریخ ان کتب میں ہمیشہ چھپائی گئی کیونکہ حکمران تاریخ لکھوانے کے لیے ہمیشہ مورخ رکھتے تھے جو ان کی خوشنودی کے لیے حکمرانوں کی شخصیت اور کارناموں کو بڑھا چڑھا کر لکھتے تھے۔ تاریخ پر حکمرانوں کے جبر کے بارے میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ''یہ وہ روزنامچہ ہے جسے مرتب کرنے کی سعادت حکمرانوں اور جرنیلوں کے حصے میں آتی ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے محلوں اور مورچوں میں محفوظ و مامون رہتے ہیں اور شہروں، بستیوں، ان میں بسنے والے انسانوں اور انسانی تمدن کو کبھی حب الوطن اور کبھی عقیدے کی سربلندی کے نام پر جنگ کے شعلوں میں جھونکتے رہتے ہیں۔'' [۲۰]

مشہور تاریخ دان ڈاکٹر مبارک علی بھی تاریخ کے بارے میں اسی طرح کا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

مورخین کے نزدیک تاریخ، حکمرانوں، امراء، علماء، صوفیاء، کے کارناموں کی تاریخ ہے اس لیے انہوں نے یہ تاریخیں شخصیت پرستی کے نظریہ کے تحت لکھیں اور بااثر حکمران طبقوں کی شخصیتوں کو بڑے مبالغے کے ساتھ پیش کیا تاکہ لوگ ان کے کرداران کی اصطلاحات اوران کی خوبیوں سے متاثر ہوں۔'' [۲۱]

یعنی تاریخ صرف اہم شخصیات کے کارناموں کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ عام آدمی کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تاریخی کتب میں معلومات ایک خاص حد تک اور خاص مقصد حاصل کرنے کے لیے ملتی ہیں۔ حکمران اصل حقائق کو چھپا کر صرف خودنمائی کے جذبے کے تحت تاریخ نویسی کی سرپرستی کرتے تھے کیونکہ یہ حکمران ظالم و جابر ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر بزدل تھے کہ ان میں ہمت ہی نہیں تھی کہ اپنے مظالم کو تحریری صورت میں دیکھ سکیں اور دستاویز کی صورت میں اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کرلیں، لیکن تاریخ ایک ایسا اژدھا ہے جسے کسی صورت میں پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ اسی حوالے سے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

''بڑے دانشوروں اور تاریخ دانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ تاریخ کے بہاؤ کو جب بھی کسی نے مخصوص مفاد والے نظریے کے مطابق روکنے یا اس کے دھارے کو موڑنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس نے ایسی تمام چیزوں کی ہنسی اُڑائی ہے۔ تاریخ کو جب بھی جبری یا غیر فطری طور پر بھلانے کی کوشش کی گئی ہے تو وہ کسی چھپلی پائی کی طرح اچانک دھم سے کود کو ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ تاریخ قوموں کا مجموعی اعمال نامہ ہے اس سے سیکھا تو جاسکتا ہے اس سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی۔'' [۲۲]

تاریخ سے اس لیے جان نہیں چھڑائی جاسکتی کہ ہر دور کی تاریخ اس عہد کا ادب لکھتا ہے۔ ادب میں ہر دور کے صحیح اور سچے تاریخی آثار ملتے ہیں۔ کسی بھی زمانے کی تاریخ کو دیکھنے کے لیے اسی دور کے ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس دور کی سچی تصاویر اس میں ملیں گی کیونکہ اپنے

عصر کی سچائی کا جتنا واضح روپ اس عہد کے ادب میں ملتا ہے وہ تاریخ کی کُتب میں نہیں ملتا۔ زاہدہ حنا تاریخ کے بارے میں اپنا ایک واضح نقطۂ نظر رکھتی ہیں جس کا اظہار وہ 'زیتون کی ایک شاخ' میں یوں کرتی ہیں کہ

تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔ تم نے ہماری صرف تاریخ پڑھی ہے۔ ہمارا ادب نہیں پڑھا۔ تم کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں سمجھنا چاہتے ہو تو ہمارا ادب پڑھو۔'' [۲۳]

اسی لیے دنیا کی تاریخ اور تہذیب کے دَور ادب کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں۔ شیکسپیئر کا دور، غالب کا دور، سرسید کا دور، آزادی کی جدوجہد اور ترقی پسند ادب کا دور وغیرہ۔ اس بات کی تائید میں اُردو ادب کے حوالے سے جعفر زٹلی کی مثال دی جاسکتی ہے کہ جعفر زٹلی کی پھانسی کو ادب نے محفوظ رکھا۔ تاریخ میں یہ بات نہیں ملتی کہ بادشاہ فرخ سیر نے اس شعر کی پاداش میں اسے تسمے کے پھندے سے ہلاک کرایا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشا ہے تسمہ کُش فرخ سیر [۲۴]

تاریخ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کبھی عام آدمی کے حوالے سے بات نہیں کرتی لیکن ادب ہمیشہ انسانوں اور ان کے مسائل سے سروکار رکھتا ہے۔ میلان کنڈیرا نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ

''تاریخ نویسی معاشرے کی تاریخ لکھتی ہے آدمی کی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ناول جن تاریخی واقعات کا ذکر کرتے ہیں ہیں وہی ہیں جنہیں تاریخ نویسی اکثر بھلا دیتی ہے اور زاہدہ حنا انہیں بھولے ہوئے کرداروں کو اپنے ساتھ لے کر چلتی ہے۔'' [۲۵]

زاہدہ حنا کا تاریخ کا وسیع مطالعہ ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں آسمانی صحائف، اساطیر، حکایتوں، قدیم داستانوں کے بعض کرداروں کو ہم عصر ماحول میں نئی تعبیر دیتی ہیں۔ اساطیر کے سلسلے میں عیسائی، ہندو دیو مالا سے بہت متاثر ہیں۔ آسمانی صحائف میں زاہدہ حنا قرآن، انجیل، زبور، اوستا کو بطورِ خاص پسند کرتی ہیں۔ عربی و فارسی حکایات اور بعض اوقات تاریخی شخصیات کو

بھی علامت کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ زاہدہ حنا کوشش کرتی ہیں کہ اجتماعی تاریخ سے کچھ نتائج اخذ کریں اور ان نتائج سے اپنے عہد کی حقیقت کا ایک نئے طریقے سے ادراک کریں۔

زاہدہ حنا نے کائنات اور اس میں انسان کی وحشت و بربریت کا مطالعہ تاریخ کے تناظر میں ایک نئے انداز سے کیا ہے۔ وہ بائبل کے حوالے سے کائنات کی تخلیق کے بارے میں کہتی ہیں کہ خدا نے کائنات چھ دِنوں میں بنائی اور ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ وہ خدا سے شکوہ کرتی نظر آتی ہیں کہ جس دن اس نے کائنات میں امن، انصاف، رحمدلی کا عنصر شامل کرنا تھا اس دن اس نے کوئی کام نہیں کیا۔ اس لیے دُنیا میں دہشت گردی اور بربریت کا بازار گرم ہے۔ یہ شکوہ زاہدہ حنا کی تحریروں میں جابجا ملتا ہے۔

آج دُنیا میں انسانی وحشت عروج پر ہے تو اس کی وجہ خدا کی انسان میں امن کی خواہش نہ ڈالنا ہے۔ قتل و غارت اور فسادات انسانی سرشت میں شامل ہے۔ انسان ابتدا ہی سے اپنے جیسے انسانوں کو مارتا چلا آ رہا ہے۔ ظلم کی ابتداء آج سے نہیں ہوتی بلکہ ازل ہی سے انسان اسی جنون کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ زاہدہ حنا تاریخ کا صرف بحیثیت مضمون ہی مطالعہ نہیں کرتیں بلکہ جدید انسان کی طبیعت میں موجود وحشت، بربریت اور تشدد پسندی کے جذبے کا سُراغ تاریخ سے ڈھونڈتی ہیں کہ انسان شروع ہی سے وحشی پن اپنی فطرت میں رکھتا ہے۔ وہ تاریخ کے تناظر میں اس جذبے کے تسلسل کو موثر انداز میں ہابیل اور قابیل کی اساطیر کے ذریعے یوں بیان کرتی ہیں:

> ''اسے ہابیل اور قابیل کا قصہ یاد آیا۔ اُس پرانے قصے میں ایک قاتل تھا دوسرا مقتول، لیکن یہاں بلاؤں کی نئی اور ناقابلِ یقین طلسم ہوش رُبا لکھی جارہی تھی، خود ہی قاتل، خود ہی مقتول، آپ ظالم آپ مظلوم، قابیل کو اس کی عروس کی ہوس میں قتل کیا تھا اور شہر میں عروسِ اقتدار کے لیے قابیل قتل کر رہا تھا، قابیل قتل ہو رہا تھا، ہابیل قتل ہو رہا تھا، ہابیل قتل کر رہا تھا۔''[۲۶]

اس تاریخی حوالے سے زاہدہ حنا کے موضوع کی وسعت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے کہ تاریخ سے انسان کبھی نہیں سیکھتے۔ تاریخ ہی کے تسلسل کو انسان آگے بڑھا رہے ہیں۔ ظلم وستم میں اضافہ تسلسل سے جاری ہے۔ آج جس بے دردی سے انسانوں کو جنگ کا ایندھن بنایا جا رہا ہے تو

یہ ازل ہی سے شروع والا سلسلہ ہے۔ ''آتشِ نمرود'' کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''یہیں کہیں آتشِ نمرود بھڑکائی گئی تھی، لیکن آتشِ نمرود تو ہر زمانے اور ہر زمین میں دہکائی گئی، ہیروشیما اور ناگاساکی کی، مائی لائی اور تورا بورا، بغداد اور بصرہ، آتشِ نمرود کا امریکی ورژن، نمرود نے یہ سارا اہتمام اکیلے ابراہیم کے لیے کیا تھا۔ یہاں تو ہزاروں اور لاکھوں لوگ آتشِ نمرود کے امریکی ورژن کا ایندھن۔'' [۲۷]

ہر دور میں طاقتور طبقہ آتشِ نمرود بھڑکاتا ہی آیا ہے۔ معدوم ابنِ معدوم، بہ ہر سو رقص بسمل بود، گُم گُم بہت آرام سے ہے، جاگے ہیں خواب میں، رقصِ مقابر، نیند کا زرد لباس، میں تاریخ کے حوالے سے انسانی جبلت میں موجود بربریت کو موضوع بنایا ہے کہ اس میں صرف اضافہ ہی ہوا ہے کمی نہیں۔

زاہدہ حنا جس علاقے یا مُلک کو موضوع بناتی ہیں اس کی تاریخ، تہذیب کا بغور مطالعہ کرتی ہیں۔ ان کے افسانے ''گُم گُم بہت آرام سے ہے'' میں نسوانی کردار گُم گُم انڈیا میں موجود دادی کو خط کے ذریعے کابل کی پوری تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ اس حوالے سے علی احمد فاطمی رقمطراز ہیں:

''کابل کی تاریخ وتہذیب۔ خط کہانی اور کہانی کتاب میں تبدیل ہوگئی ہے۔ ایک ہندو لڑکی کا کردار لاکر اس کہانی میں ہندو مُسلم ہندوستان، افغانستان کے رشتے تہذیبی حوالے اور پھر انسانیت کے معالے جس طرح سے آئے ہیں وہ زاہد کے تاریخی نگاہ اور تہذیبی شعور کی غمازی کرتے ہیں۔'' [۲۸]

زاہدہ حنا ہندو متھالوجی سے بہت متاثر ہیں۔ راون اور سیتا کی متھالوجی کو ایک نئی معنویت حال کے تناظر میں اس طرح دی ہے کہ امن کی سیتا کو وحشت کا راون اُٹھا کر لے گیا ہے۔ اس لیے معاشرے میں وحشت کا راج ہے۔

آج دنیا اقتدار کی جنگ میں مصروف ہے۔ جمہوریت اور انسان دوستی کا نعرہ لگا کر طاقتور کمزور ممالک پر قبضہ کر رہے ہیں۔ زاہدہ حنا کو تاریخ سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ اُن کے

نزدیک ماضی کے لوگوں میں حال کے انسانوں کی نسبت مروت اور انسانی ہمدردی موجود تھی۔ وہ تاسف کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں کہ حال میں انسان اپنے اندر کے وحشی پن کو دنیا پر لاگو کر رہا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ قدیم بادشاہ اپنے اندر اتنی انسانیت رکھتے تھے کہ دوسرے ممالک پر ایک دم سے حملہ کرنے کی بجائے پہلے پیغام بھجوا دیتے تھے اور اپنے حملے کا مقصد بھی واضح طور پر بتا دیتے تھے۔ نیز اپنے ممالک اور لوگوں کی حفاظت بھی کرتے تھے، لیکن آج صورتِ حال اُس کے بالکل برعکس ہے۔ محمد ظہیر الدین بابر کی روح اپنے عہد کی تاریخ غیر جانبداری سے یوں بیان کرتی ہے:

"ان سے اچھے تو ہم تھے جو سربلندی اسلام کے لیے نہیں اپنی امارت و بادشاہت کے لیے لڑتے تھے میں نے جو ابراہیم لودھی سے ہندوستان کی سلطنت چھینی تو کون سی خدمت اسلام کی کی، ہاں جب کفار کے مُلک فتح کرتے تو کچھ فائدہ دینِ مبین کا بھی ہو جاتا۔" [۲۹]

محمد ظہیر الدین بابر کی روح حال کے حکمرانوں کی بے حسی دیکھ کر دُکھ بھرے انداز میں تبصرہ کرتی ہے۔ زاہدہ حنا تاریخ کے نوحہ گر یسعیاہ اور یرمیاہ کے حوالے سے آج کے حکمرانوں کی بے حسی پر طنز کرتی ہیں کہ ان نوحہ گروں نے اپنے شہروں اور لوگوں کی بربادی پر بہت شاندار نوحے لکھے جو ڈھائی ہزار سال بعد بھی بہت مشہور ہیں مگر اب انسان کے جنون میں اس قدر اضافہ ہو گیا ہے کہ لوگوں کے پاس رونے کی فرصت ہی نہیں۔ وہ کس کس دُکھ کو روئیں اور کس کس غم میں اپنا سینہ پیٹیں۔ دنیا ظلم و ستم کا ایسا بازار بن چکی ہے کہ دُکھ اور فکرِ معاش کسی انسان کو سر اُٹھانے کے قابل ہی نہیں رہنے دیتے بجائے اس کے کہ بیٹھ کر اپنے اور معاشرے کے دُکھ پر مرثیے لکھیں۔ یوں زاہدہ حنا بڑے منفرد انداز میں تاریخ کے جبر کے مختلف چہرے، حال میں موجود عالمی سیاست کے تناظر میں دکھا کر اپنے موضوع میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتی ہیں۔

مرد اور عورت کے درمیان ایک فطری رشتہ ہے۔ یہ ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ کشش ان کی فطرت میں شامل ہے۔ زاہدہ حنا اس بات کو آدم و حوا کے ذریعے اس طرح بیان کرتی ہیں:

"وہ ہماری کشتی کے ساتھ تیر رہا تھا ہم پر پانی کے چھینٹے اُڑاتا، پانی میں

ڈبکی لگا کر پھر اُبھرتا ہوا اُس کے ننگے بدن کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا جیسے
میں نے اس کی پسلی سے جنم لیا ہو جیسے ہم ایک تن ہوں۔ زمین کا پہلا
جوڑا۔'' [۳۰]

زاہدہ حنا صرف عورت اور مرد کے درمیان تعلق پر ہی بات نہیں کرتیں بلکہ عورت ذات کا منفرد پہلو یاجوج ماجوج کی اساطیر کے حوالے سے بیان کرتی ہیں۔ یہ اساطیر بہت مشہور ہے، لیکن زاہدہ حنا نے یاجوج ماجوج کی فوج سے نہ ختم ہونے والی دیوار کو عورت کی اَنا اور خودداری کے ساتھ اس طرح جوڑا ہے کہ اس میں بے پناہ وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اس انا کی دیوار کو عورت چاہ کے بھی ختم نہیں کر سکتی کہ اس کے خاتمے سے عورت کی ذات اپنی اہمیت کھو دے گی۔ اپنی عزتِ نفس کو بچانے کے لیے وہ عشق کی وادیِ پُر خار میں رہنا پسند کرتی ہے۔ وصل جو کہ آسان راستہ ہے اس میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ ''پانیوں میں سراب'' میں اس اساطیر کو بیان کیا گیا ہے۔

زاہدہ حنا کو تاریخ سے والہانہ عشق ہے وہ صرف تاریخ کو پڑھتی نہیں بلکہ اس کے ساتھ گھومتی ہیں۔ حال اور تاریخ کے درمیان مماثلت تلاش کر کے ہمارے سامنے اس کو رکھ دیتی ہیں۔ اس کے ہاں تاریخ محض گزشتہ افراد کا قصہ نہیں بلکہ آج کے تجربے میں ان کی شمولیت ہے۔ صرف تاریخ ہی نہیں بلکہ خیال، احساس، جذبہ، تخیل اور واقعہ کو اس طرح تخلیق کا حصہ بناتی ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی حوالے سے رضیہ فصیح احمد لکھتی ہیں:

''تاریخ، مذاہب، اساطیر اور ادب میں زاہدہ کا مطالعہ خوب ہے، مگر
انسانوں کا مطالعہ بھی اس نے کم نہیں کیا ہے کہ دن رات اس کا معاملہ
انسانوں سے ہے۔ جب آپ نے اتنی کتابیں پڑھی ہوں اور انسانوں کا
مطالعہ کیا ہو تو آپ بڑے افسانہ نگار بننے کے حق دار ہیں بشرطیکہ آپ
میں لکھنے کا شعلہ، ذہانت کی آنچ اور دیانت کا لپکا ہو زاہدہ میں یہ تمام
خصوصیات ہیں۔'' [۳۱]

تاریخ سے اسی لگاؤ کے باعث وہ قدیم مذاہب اور تہذیبوں کا وسیع مطالعہ رکھتی ہیں۔ ذرتشت مذہب سے اُنہیں بے پناہ عقیدت ہے۔ اس مذہب کو زاہدہ حنا بطور خاص اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہیں اور اسی حوالے سے ایک ناولٹ ''نہ جنوں رہا نہ پری رہی'' بھی تحریر

کیا۔ زاہدہ حنا کو اس قدیم اور زرخیز تہذیب کی پامالی اور بربادی کا بہت زیادہ دُکھ ہے۔ وہ اس عقیدے کی تاریخ کو اس طرح بیان کرتی ہیں۔

''بات دراصل یوں ہے کہ وہ خاندان جو کتابوں سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں وہ اپنی اصل کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ آج اس جہاز کو دیکھ کر مجھے اپنے جدِ اعلیٰ بہروز پور ہرمز کی یاد آ رہی ہے جو شیز میں شاہانِ ایران کے مخصوص آتش کدے 'آذر خش' کے ایک موبد تھے اور جنہوں نے شیز پر مسلمانوں کے قبضے کے وقت دیگر موبدوں کے ساتھ ہند کی جانب فرار ہونے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ ان کے ساتھی مارے گئے اور وہ غلام بنا لیے گئے۔ غلامی سے نجات کا واحد طریقہ مسلمان ہو جانا تھا۔ سو وہ اسلام لائے ___ کسی مذہب کو قبول کر لینے سے چشم زدن میں آپ کا کلچر نہیں بدل جاتا ___ وہ بہروز پور ہرمز سے مانک ابن ہرمز ہو گئے تھے، لیکن ایرانی کلچر سے اور آذر خش کے عظیم پس منظر سے دستبرداری ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے اور ان کے بیٹوں نے شیعیت، شعوبیت اور تصوف میں پناہ لی۔'' [۳۲]

زرتشت تہذیب سے لگاؤ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے کلچر کی بنیاد عرب کی بجائے عجم کی تہذیب پر ہے جسے مختلف بہانوں سے تباہ کیا گیا۔ بربریت کی یلغار نے تمدن کو نقصان پہنچایا۔ زاہدہ حنا کا دُکھ اپنی ذات کا دُکھ نہیں بلکہ نسلوں کی تباہی کا دُکھ ہے۔ یہ دُکھ انہیں اس شعور نے بخشا ہے کہ منفی قوتیں مذہب اور جغرافیے کا سہارا لے کر تہذیبوں کو نقصان پہنچاتی ہیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ [۳۳]

زاہدہ حنا کی تحریروں میں غور و فکر کا رنگ سب سے نمایاں ہے وہ کسی بھی موضوع کو احاطۂ تحریر میں لانے سے قبل خوب غور و فکر کرتی اور ہر پہلو پر نظر رکھتی ہیں۔ اس کے بعد فطری مناسبت کے سبب اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بناتی ہے۔ انہوں نے انتہائی کمال کے افسانے تحریر کیے ہیں۔ پارسی مذہب میں ''آگ'' کی بہت زیادہ اہمیت ہے اسے مقدس مان کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ آتش کدوں میں جلنے والی آگ کے مختلف درجے ہیں۔ آتش پرستوں کے نزدیک

آ گ حقیقت مطلق کا مظہر تھی۔اس لیے اس بات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا کہ آ گ بجھنے نہ پائے کسی آ تش کدے کی آ گ بجھ جاتی تو سمجھا جاتا تھا کہ آ ہورامزدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے۔ آ تش کدوں کی آ گ کی تجدید بھی وقتاً فوقتاً کی جاتی تھی۔آ تش کدوں میں لوبان اور خوشبودار لکڑیوں کو جلایا جاتا تھا جن کی خوشبو سے آ س پاس کا علاقہ مہک اُٹھتا تھا۔[۳۴]

اس نہ بجھنے والی خوشبودار آ گ سے زاہدہ حنا کو بے پناہ محبت ہے جسے اس اقتباس میں واضح طور پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

''میرے شہر کی ایک بارونق سڑک پر سرمئی رنگ کی ایک عمارت ہے۔اس عمارت میں سیاہ دیواروں والا ایک حجرہ ہے اور اس حجرے میں کبھی نہ بجھنے والی آ گ بھڑکتی رہتی ہے۔میرا جی چاہتا ہے کہ میں سیاہ دیواروں والے اس حجرے میں قدم رکھوں اور اس درخشاں آ گ کے سامنے جھک جاؤں ـــــ مجھے نہیں معلوم میرے سینے میں آ گ کا کون سا درجہ روشن ہے۔''[۳۵]

زاہدہ حنا کے اس حد تک لگاؤ کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسانیت سے محبت ایک آ فاقی جذبہ ہے۔انسانیت کی پامالی چاہے کسی بھی بہانے ہو دانشوروں اور تخلیق کاروں کو دُکھ دیتی ہے۔ وہ اس کا کسی نوعیت کا جواز قبول کرنے پر تیار نہیں۔

'فنا' زاہدہ حنا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ان کے مطابق ہر چیز نے فنا ہونا ہے اور بقا صرف وقت کو ہے وقت سے مُراد کائنات کا تسلسل ہے۔یعنی کائنات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔صرف ہمارے جیسے لوگ آتے اور جاتے رہیں گے۔اس موضوع کو بیان کرنے کے لیے وہ الف لیلیٰ کا مشہور تاریخی کردار شہرزاد استعمال کرتی ہیں۔ جو اپنی جان بچانے کے لیے بادشاہ کو ایک ہزار ایک رات تک داستانیں سناتی رہی اور وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ

''سارے دریا ایک ہیں تمام شہر ایک ہیں۔تمام انسانوں کا مقدر ایک ہے۔شہر کا لہجہ اُداس ہو گیا' میں شہزاد ایک ہزار ایک برس تک میں نے کہانیاں سنائیں۔ایک ہزار ایک داستانیں،تب کہیں جان کی امان پائی۔ ان داستانوں میں سانس لیتی ہوئی عورتیں،مرد،شہر،دریا،فنا سب کا مقد

ہے نیستی سب کی تقدیر۔'' [۳۶]

زاہدہ حنا کے مطابق کائنات کی کوئی بھی چیز فنا سے بھاگ نہیں سکتی۔عصائے سلیمانی، تختِ بلقیس، محلات، مقبرے سب کا مقدر فنا ہے۔ شیریں چشموں کی تلاش، رنگ تمام خوں شد، صرصرِ بےاماں، معدوم ابنِ معدوم، منزل ہے کہاں تیری اور دیگر افسانوں میں تاریخی حوالوں سے زاہدہ حنا نے اس موضوع کی ابدیت کو ثابت کیا ہے۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں اسلام کے ساتھ ساتھ بدھ مت، ہندومت، زرتشت، رگ وید کے حوالے جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں کس جگہ کو موضوع بناتے ہوئے اُس کی تاریخ، مذہب اور مشہور شخصیات کا حوالہ ضرور دیتی ہیں۔ وہ تاریخ کے چند نکات کو پھیلا کر حال سے جوڑتی ہیں اور تسلسل چیزیں بیان کرتی ہیں۔ شاعری کے باوا آدم ہومر نے کہا تھا کہ میں دُعا کرتا ہوں کہ حقیقتِ حال بیان کر سکوں۔ حقیقتِ حال سے مراد ماحول سے آگاہی ہے۔ یہ ہے ادب کا کام۔ ہر سماج کی زندگی میں مختلف ادوار آتے ہیں اور عہد کے چند پہلو یا چند موضوعات اساسی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جب کوئی ادیب اِن کو بیان کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اُس کی تصنیف اپنے عہد کی تاریخ بن جاتی ہے اور زاہدہ حنا اپنے عہد کو تاریخ کے تسلسل میں دیکھتی اور تاریخ کا حصہ بناتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی تاریخ کو اپنے افسانوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس میں وہ انتہائی کامیاب نظر آتی ہیں۔ اُن کا مختلف مذاہب، تاریخ اور اساطیر کا وسیع مطالعہ اور گہرا شعور ہے جسے وہ انسان کے مطالعے سے آمیز کر کے اپنے خاص انداز میں پیش کرنے کا ہُنر جانتی ہیں۔ بلاشبہ ان کا وسیع مطالعہ حیرت انگیز ہے، لیکن افسانے کی اپنی شعریات ہوتی ہیں۔ تاریخ اور فکشن علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، لیکن ان کے ہاں کہیں کہیں تاریخی معلومات ارادتاً دی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو افسانے کے حُسن پر گراں گزرتی ہیں۔

زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری میں یہ خاصیت نظر آتی ہے کہ اپنے تخیل کو علاقائی سرحدوں اور مشاہدے کو خاص رنگ کی عینک سے ہی نہیں دیکھتیں اس لیے اُن کے افسانے اُن کی ریاضت اور محنت کی دلیل ہیں اور یہ محنت اُن کے ہم عصروں میں کم ہی نظر آتی ہے۔

زاہدہ حنا کا سماجی شعور

انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران ہندوستانی معاشرہ زبردست شکست وریخت اور غیر معمولی انتشار کا شکار رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں کی مکمل طور پر حکمرانی سے ایک نئی تہذیب اور جدید طرزِ فکر کی قدیم اور فرسودہ تہذیب پر فتح تھی۔ فرسودہ معاشرے کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب کی عمارت بُلند ہوئی۔ اسی عہد میں سرسید نے تحریک چلائی کہ فن و ادب کا عمل معاشرتی صورتِ حال کے تابع ہوتا ہے اور اس کی عکاسی ادب میں ہونی چاہیے۔ معاشرے میں آنے والی تبدیلی کا اظہار ادب کرے اور معاشرے میں بہتری لانے کی کوشش کرے کیونکہ کوئی بھی ادیب اپنی دھرتی سے اغماض نہیں برت سکتا ہے۔ دھرتی اس کی روح میں بہت گہرائی تک اُتری ہوتی ہے۔ ادیب اپنی تخلیقات کا مواد دھرتی سے لیتا ہے کیونکہ ادب کا زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ ادب خلا میں تخلیق نہیں کیا جاتا بلکہ یہ معاشرے سے جُڑا ہوتا ہے۔

ادب اور زندگی کے حوالے سے خاور نوازش لکھتے ہیں:

> ''ادیب خواہ کسی دور کا بھی ہو زندگی کے ساتھ اس کا ربط نہایت گہرا ہوتا ہے اور وہ اپنی تخلیقات میں جو کچھ پیش کرتا ہے وہ زندگی اور اس سے جُڑے ہوئے معاشرتی مسائل کے مختلف پہلوؤں کا ہی ایک عکس ہوتا ہے یہ ایک مُسلم بات ہے کہ کوئی بھی ادیب اپنے معاشرے اور عصری زندگی سے کٹ کر ایسا فن پارہ تخلیق نہیں کرسکتا جو ادب کے دائرہ کار میں آتا ہے۔'' [۳۷]

زاہدہ حنا بہت ہی باشعور اور باصلاحیت ادیبہ ہیں۔ انہیں اپنے معاشرے کے مسائل کا گہرا شعور ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں معاشرہ اور اس کو درپیش مسائل ہی کو پیش نہیں کرتیں بلکہ ان مسائل کے پس پردہ محرکات کا سُراغ لگانے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔

زاہدہ حنا با قاعدہ طور پر ترقی پسند تنظیم سے وابستہ نہیں ہیں، لیکن ادیب کبھی بھی اپنے معاشرے اور اُس کے مسائل سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے زاہدہ حنا کا تخلیقی سرمایہ معاشرتی مسائل ہی کا عکاس ہے۔ ترقی پسند سوچ کو نہ تو کسی خاص تنظیم کے دائرہ اثر تک محدود کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی عہد، عقیدے، قوم اور گروہ سے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ 'ترقی پسندیت' کی اصطلاح ترقی پسند تحریک نے باقاعدہ طور پر متعارف کرائی، لیکن اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن ادبی رجحانات، تصورات اور خیالات کے دفاع اور فروغ کے لیے اِس تنظیم کا قیام عمل میں آیا اِن تصورات، خیالات اور رجحانات کا حامل ادب اِس تحریک سے قبل بھی تخلیق ہورہا تھا۔

زاہدہ حنا کا تخلیقی سفر گذشتہ تقریباً چار عشروں سے رواں ہے، لیکن ہر دور میں اُنہوں نے اپنے تخلیقی ادب کو سماجی عمل کا ہی حصہ جانا اور وہ ہر قسم کے ظلم، استبداد اور ناانصافی کی دشمن ہیں۔ آزادی، سامراج دشمنی، غیر فرقہ وارانہ روشن خیالی، اتحاد، عمل پسندی اُن کے آدرش ہیں۔

ہندو، مسلم یہ نام اب جس قدر الگ الگ شناخت کے حامل ہیں ۱۹۴۷ء سے قبل ایسا نہ تھا۔ یہ دونوں ایک ہزار سال تک اکٹھے سکون سے زندگی بسر کرتے رہے ہیں، لیکن جدید نوآبادیات نے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرکے ان پر حکومت کرنے کے لیے مذہبی تعصب کو ہوا دی۔ ان کی الگ الگ شناخت پر زور دیا اور پھر تقسیم ہندوستان کے موقع پر خاک وخون کی وہ ہولی کھیلی گئی کہ انسانیت کی روح تک لرز اُٹھی۔ انسان اپنی تاریخ اپنے ماضی سے یکدم کٹ گیا۔ زاہدہ حنا کے نزدیک آج ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی لایعنیت، خوف، بے یقینی، ذہنی انتشار، اقدار وروایات کی شکست و ریخت، نظریات وتصورات کی ناپائیداری کی وجہ تقسیم کا عمل ہے چونکہ انسان اپنے درخشندہ ماضی سے کٹ گیا ہے اس لیے اب اس کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔

تقسیمِ ہندوستان کی سب سے ہولناک بات یہ تھی کہ انسان جیسی قیمتی چیز سب سے ارزاں ہوگئی اور اس کی ارزانی میں مذہب نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ زاہدہ حنا کا مذہب کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ ہر کسی کا ذاتی مسئلہ ہے، لیکن چند باشعور اور تعلیم یافتہ لوگوں کے علاوہ ہمارے معاشرے میں ایسا کوئی نہیں سوچتا۔ مذہب کے حوالے سے ہمارے اندر شدت پسندی

کے جذبات اُبھر رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے افراد میں برداشت کرنے کا مادہ کم ہوتا جارہا ہے۔ اپنے سوا کسی دوسرے کو مذہبی آزادی کی اجازت نہیں اور یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں مسلمان اپنے رویے کی وجہ سے مسائل کا شکار ہیں۔ زاہدہ حنا اسی عدم برداشت اور شدت پسندی کے حوالے سے جنم لینے والے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بناتی ہیں کیونکہ ادیب صرف واقعات کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ وہ غلط نظام، ناانصافی اور ظلم کو مٹانے کی جدوجہد میں قلم کے ذریعے حصہ بھی لیتا ہے۔

زاہدہ حنا نے اپنے افسانے ''منزل ہے کہاں تیری'' میں بابری مسجد کی شہادت کو موضوع بنایا ہے۔ اس مسجد کی شہادت کے بدلے میں جس بے رحمی سے مندروں اور ہندوؤں کا قتلِ عام ہوا وہ ہمارے انتہا کے متعصب ہونے کی شہادت ہے۔ زاہدہ حنا ان لوگوں کے لیے بہت دُکھ اور تکلیف محسوس کرتی ہیں جو بہت اچھے انسان ہونے کے باوجود صرف مسلمان نہ ہونے کی بناء پر بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ ان کے حق میں زاہدہ حنا کا بے تعصب نقطۂ نظر یوں سامنے آتا ہے:

> ''عالیہ کا دل شق ہونا لگا مدن کے لیے، اوشا کے لیے، اوشا کے پتا کے لیے، ایسے ہی کروڑوں انسانوں کے لیے جن کے خون آلود جغرافیے پر نفرتوں کے قطبین تھے، عالیہ کو اس لمحے شدید برف باری کے بعد سڑکوں پر جمی ہوئی برف صاف کرنے کے لیے نکلنے والی گاڑیاں یاد آئیں جو نمک چھڑک کر منٹوں میں برف کی گہری تہہ کو پگھلاتی چلی جاتی ہیں۔ اس کے، مدن کے اور دوسروں کے پاس ایسا نمک کیوں نہ تھا۔'' [۳۸]

مذہبی تعصب معاشرے میں تنگ نظری کو فروغ دیتا ہے۔ تنگ نظر معاشرے میں گھٹن، انتشار اور بے چینی پائی جاتی ہے۔ ہر چیز کو صرف مذہب کی عینک سے دیکھا جاتا ہے۔ عقل، شعور، ترقی کا عمل ایسے معاشروں میں رُک جاتا ہے اور ہمارا معاشرہ اس کی عملی تفسیر ہے۔

ہمارے ملک میں دہشت گردی اور انتشار عروج پر ہے۔ ویسے تو دہشت گردی نے پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، لیکن بعض علاقے ایسے ہیں جن میں ہمارا ملک بھی شامل ہے

اس کے شدید ترین عذاب کو جھیل رہے ہیں۔ آئے روز کتنے معصوم اور بے گناہ شہری اس آگ میں ایندھن کے طور پر جھونکے جا رہے ہیں۔ تخلیق کار اپنے عہد سے لاتعلق رہ کر ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کا عہد اور اُس کے عہد کے مسائل اُس کی تخلیقات میں اپنی جھلک ضرور دکھاتے ہیں۔ زاہدہ حنا عالمی منظرنامے پر چھائی دہشت گردی اور پاکستان میں خاص طور پر کراچی میں بپا دہشت گردی کو خصوصی طور پر اپنا موضوع بناتی ہیں۔ موجودہ دور میں افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر افسانے لکھے ہیں، لیکن زاہدہ حنا کا اس موضوع پر لکھا افسانہ ''بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود'' اپنی شدت اور تاثیر کے باعث درجۂ کمال تک پہنچتا نظر آتا ہے۔ زاہدہ حنا کے نزدیک اس مسئلے کی زد میں آنے والے لوگوں کے مختلف زبان، علاقوں، تہذیبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کا مسئلہ اور اس سے پیدا شدہ دُکھ ایک ہی ہے۔ یوں دردوغم کی ایک مشترک اور دل کو مٹھی میں لینے والی زبان کتنے ہی لوگوں میں اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بن گئی ہے۔ اس افسانے کے حوالے سے مبین مرزا یوں لکھتے ہیں:

> ''دہشت و بربریت کا طوفان ماؤں سے کس طرح اُن کی عمر بھر کی جمع پونجی، اُن کے بڑھاپے کا سہارا، ان کی جوان اولاد چھینتے ہوئے آگے اور آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے، کس طرح موت ایک ایک در جھانکتی اور کوچہ و بازار میں ناچتی پھر رہی ہے اور یہ تجربہ رنگ و نسل اور ملک و ملت کے کسی امتیاز کے بغیر پھیلتا جا رہا ہے اور درد کی سوغات نہتے، بے بس اور بے خطا انسانوں میں کس طرح بٹ رہی ہے۔ زاہدہ حنا کا افسانہ دُکھ کے ساتھ اور فن کارانہ سبھاؤ میں ہمیں بتاتا ہے۔''[۳۹]

سول وار کی سب سے بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ نہ تو مارنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کس کو مار رہا ہے اور کیوں مار رہا ہے، نہ مرنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ کس جرم کی پاداش میں اِس ظلم کا نشانہ بن رہا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''ہر تیسرے چوتھے ہڑتال اور ہڑتال کے نتیجے میں بارہ اٹھارہ بیس بائیس لاشوں کا گرنا ایک معمول کی بات تھی۔ اخبار وحشت ناک خبروں اور خون آلود تصویروں سے بھرے ہوتے۔ ایک طرف سرکار تھی جس نے شہر کو

بندوق کی نوک پر سر کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور دوسری طرف شہر تھا جسے
دوسرے شکار کر رہے تھے اور جو خود شکار کر رہا تھا اپنی ہڈیاں آپ چبا رہا
تھا۔" [۴۰]

زاہدہ حنا نے اِس افسانے میں معاشرے میں بہت زیادہ بڑھتے ہوئے دہشت گردی کے رُجحان کو اس طرح بیان کیا ہے کہ افسانہ قاری کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس افسانے میں تاریخ، تہذیب اور سیاست کے عناصر نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ اس افسانے کا کمال یہ ہے کہ زاہدہ حنا قاری کو دُکھی چھوڑ کر افسانہ ختم نہیں کرتیں بلکہ زندگی گزارنے کی جدوجہد کے لیے قاری کو حوصلہ اور ہمت دیتی ہیں۔ زندگی لایعنیت کی بجائے معنویت کے مدار کی طرف لوٹ آتی ہے۔ زاہدہ حنا بتاتی ہیں کہ ظالم کے ہتھکنڈے کبھی بدلتے ہیں اور نہ ظلم سہنے والوں کے پائے استقلال میں لغزش پیدا ہوتی ہے۔

"خداوندِ خدا کی طرح کیا غم بھی ساتویں دن آرام کرتا ہے۔ ناہید نے
سوچا۔۔۔ یا پھر درد کا دوشالہ اوڑھے یہ دونوں عورتیں مقتولوں اور قاتلوں
کی نئی فصلیں تیار کرنے نکلی تھیں۔" [۴۱]

تخلیق کار طبقہ ہمیشہ اپنی حساسیت کے سبب انسانیت پر ہونے والے مظالم کے خلاف بلاامتیاز مذہب و سرحد آواز اُٹھاتا رہتا ہے۔ ہندوستانی ادیبہ اَرُن دھتی رائے نے گجرات میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے انسانی فطرت میں موجود وحشت اور ایذارسانی پر یوں تبصرہ کیا ہے کہ

"ہندومت کی کون سی مقدس کتاب میں ہے جو ان حرکات کی تعلیم دیتی
ہے۔۔۔ قرآن کی کون سی آیت میں کہا گیا ہے کہ ان لوگوں کو زندہ جلایا
جائے؟ جس قدر دونوں فریق ایک دوسرے کو ہلاک کر کے اپنے
مذہبی فرق کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے درمیان فرق
اتنا ہی مدھم پڑتا جاتا ہے وہ ایک ہی بارگاہ میں عبادت کرتے ہیں۔
وہ ایک ہی خون کے پیاسے خدا کے ماننے والے ہیں خواہ جو بھی
ہو۔" [۴۲]

جب کوئی مذہب سے ہٹ کر صرف انسانوں کے بارے میں سوچے تو وسیع النظری کا ثبوت دیتا ہے اور ادیب اپنی تخلیقات کے ذریعے اس وسیع النظری کو معاشرے میں پھیلاتے ہیں اور قلم میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ معاشرے پر اثر انداز ہو سکے اسی لیے افلاطون شاعر کے کردار سے خوفزدہ ہے کیونکہ وہ معاشرے کے ٹھہرے پانیوں میں حرکت پیدا کرتا ہے اور وہ تبدیلی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ افلاطون اپنی ریاست میں شاعر کا وجود خطرے کی علامت سمجھتا ہے۔ اس طرح اس نے پہلی مرتبہ ادیبوں اور تخلیق کاروں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اس کے بعد آج تک اُنْ کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکا۔ اسی لیے حکمران طبقہ لکھاریوں پر مختلف قسم کی پابندیاں لگاتا رہتا ہے لیکن کامیابی اس کا مقدر نہیں۔ زاہدہ حنا کا اقلیتوں کے بارے میں نقطۂ نظر محبت آمیز ہے جو منزل ہے کہاں تیری، ہوا پھر سے حکم صادر، زیتون کی ایک شاخ، صرصرِ بے اماں کے ساتھ، زرد ہوائیں، زرد آوازیں، یکے بود یکے نہ بود میں ملتا ہے۔

۱۹۴۷ء میں الگ ملک کے حصول کے لیے جس آگ کے دریا کو عبور کیا گیا اس کی مثال تاریخِ عالم میں بہت مشکل سے ملتی ہے۔ لوگوں نے پاکستان ہجرت کی تو بہت سے خواب اور اُمیدیں لے کر آئے، لیکن جو نیا معاشرہ تشکیل پایا اس کی سب سے بڑی قدر روپیہ پیسہ تھی۔ اَب پاکستان کے لوگ اپنے ملک کو مضبوط کرنے کی بجائے پیسے کی ہوس میں ان ممالک میں جانے کے خواہاں ہیں جن سے ۱۹۴۷ء میں آزادی حاصل کرنا ہندوستانیوں کی سب سے بڑی آرزو تھی لیکن جو اپنی زمین، اپنی جنم بھومی کو ایک دفعہ چھوڑتا ہے تو دُنیا کی کسی زمین پر اپنے پاؤں نہیں جما سکتا۔ ہجرت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ زاہدہ حنا اس صورتِ حال پر دُکھ کا اظہار اس طرح کرتی ہیں:

> ''وہاں میرا مکان ہے دادی بیگم۔ وہاں ہماری ہوا اُکھڑ چکی۔ یہاں سے جانے والوں کی بڑی بڑی جائیدادیں اپنی بنیادیں چھوڑ چکیں۔ تب ہی تو سب کے بچے باہر پڑھ رہے ہیں تب ہی تو سب گرین کارڈ کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہاں سے جانے والے اپنا مقدمہ ہار چکے ہیں دادی بیگم۔'' [۴۳]

زاہدہ حنا کے خیال میں چونکہ ہجرت کے موقع پر لوگ اپنی زمین، اپنی جڑوں سے کٹ گئے اس لیے ان کی اخلاقی اقدار ختم ہو گئی ہیں ان کے صرف کھوکھلے جسم رہ گئے ہیں جو بے روح

ہیں اور ان کی سب سے بڑی قدر پیسہ ہے۔ نا گُجا آباد، پانیوں میں سراب، منزل ہے کہاں تیری، معدوم ابنِ معدم، ہوا پھر سے حکم صادر، بود و نبود کا آشوب میں یہی موضوع ملتا ہے۔

زاہدہ حنا صرف دولت کی لالچ کا معاشرتی رُخ ہی پیش نہیں کرتیں بلکہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ پیسہ معاشرے کی بہت بڑی حقیقت ہے کسی بھی آدمی کے خیالات ونظریات اس کا پیٹ نہیں بھر سکتے۔ معاشی ضروریات زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہیں اور اس حقیقت کو یوں بیان کرتی ہیں:

''میں اکثر سوچتی ہوں کہ آئیڈیل، آدرش، خواب یہ سب کتنے خوبصورت اور دل آویز لفظ ہیں، لیکن روپیہ جو کہ محض مایا ہے اور ہر عہد میں لعنت قرار دیا گیا ہے وہی دُنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے خواب پیسے کے بغیر نہیں خریدے جاسکتے۔ آدرش کی باتیں بھوکے پیٹ اور ننگے تن زیادہ دِنوں نہیں چلتیں۔'' [۴۴]

لوگوں کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے روپیہ پیسہ چاہیے اور اس کے لیے لوگوں کو بڑے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ موجودہ مہنگائی کے دور میں وضع دار افراد کے لیے سفید پوشی کا بھرم رکھنا کس قدر بڑا مسئلہ ہے۔ زاہدہ حنا اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ''تقدیر کے زندانی'' میں لکھتی ہیں:

''جاؤ بھئے جاؤ ___ اللہ بیلی''

دادی صاحب کہتی اور اسے دروازہ بند کرنے کا اشارہ کرتیں۔ نوٹ ان کی مٹھی میں مضبوطی سے دَبے ہوتے۔ پہلے وہ سمجھتا تھا کہ نوٹ بھی کبوتر کی طرح اُڑ جائیں گے یہ بات اس کی سمجھ میں کچھ دِنوں بعد آئی کہ کبوتر اُڑائے جائیں تو لوٹ کر چھتری پر آجاتے ہیں لیکن نوٹ مٹھی سے نکل جائیں تو کبھی نہیں آتے۔'' [۴۵]

زاہدہ حنا ایک تہذیب یافتہ، سفید پوش طبقے کی معاشی حالت اور زندگی کی ٹھوس حقیقت پیسے کی طاقت اور حقیقت کو اس افسانے میں بیان کرتی ہیں۔

زاہدہ حنا اپنے افسانے ''آخری بُوند کی خوشبو'' میں اِس تلخ سماجی حقیقت کو بیان کرتی

ہیں کہ اگر کسی کے گھر میں بھوک ناچ رہی ہو تو باہر اُس کو من وسلویٰ بھی کھانے کو ملے تو اپنوں کے بغیر ایک نوالہ بھی لینا ممکن نہیں۔ اِس افسانے میں زاہدہ حنا فنکارانہ انداز میں فرد کے بطن میں جاری خیالات، جذبات اور احساسات کے تلاطم اور غیر مرئی فضا کو مجسم کرتی نظر آتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سائیں فیض بخش کی آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ وڈیرا سائیں اور اُن کے مہمانوں کے اسرار کے باوجود وہ سر جھکائے خالی پلیٹ میں کڑھے ہوئے پھولوں سے کھیلتے رہے۔ ایک بے چراغ گھر کی بھوک چینی کی پھول دار پلیٹ میں پھن کاڑھے بیٹھی رہی۔ ان کی اُنگلیوں کو ڈستی رہی اور اس کا زہر کھانے کی خوشبو کے ساتھ ساتھ نتھنوں کے راستے اُن کے معدے میں اُترتا رہا۔[۴۶]

برسرِ اقتدار طبقہ ادب اور ادیب کو صرف اپنی تعریفوں اور خوشامد کے لیے پسند کرتا ہے۔ ادیب اگر معاشرے کے لیے آواز بلند کرے تو اس کو کڑی سزا دے کر اس کے قلم کو خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن زاہدہ حنا ادب میں زندگی کے تنقیدی پہلو کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ وہ ادیب کو معاشرتی سچائیوں سے نظریں ملانے کی ترغیب دیتی ہیں۔ میتھیو آرنلڈ نے ادب کو 'تنقید حیات' کہا تھا یعنی صرف زندگی کو پیش ہی نہ کریں بلکہ اس کے تاریک پہلوؤں کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کریں اور زاہدہ حنا اس پر کارفرما نظر آتی ہیں۔ وہ ادیبوں کو اُن سماجی ذمہ داری کا احساس دلاتی ہیں کہ معاشرے پر تنقید کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ پانیوں میں سراب، جسم وزباں کی موت سے پہلے، بہ ہر سو رقصِ بسمل بود اور دیگر افسانوں میں یہ موضوع ملتا ہے۔

زاہدہ حنا چیزوں میں پوشیدہ حقیقت کی متلاشی ہیں۔ وہ تصویر کا وہ رُخ جو دکھایا جا رہا ہو اس پر کبھی یقین نہیں کرتیں بلکہ حقیقت کی تلاش خود کرتی ہیں اور اس حقیقت کو اپنی تخلیقات کے ذریعے دُنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ سندھ کی جو تصاویر میڈیا میں دکھائی جاتی ہیں ان میں اس علاقے کی خوبصورتی، رنگینی پر زور دیا جاتا ہے۔ عورتوں کے رنگ برنگے لباس اور زیورات سے اِن علاقوں کی شناخت کی جاتی ہے، لیکن اصل سندھ یہ نہیں زاہدہ حنا نے سندھ کی

حقیقت کو اپنے افسانے ''رنگ تمام خون شد'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''لیکن جو سندھ اُنہیں دیکھتی آنکھوں نظر آ رہا تھا اس کی بستیوں سے زندگی شیشے کی گُرگابیاں پہن کر کبھی نہیں گزری تھی اس کے ڈنگر اور اس کے بچے ایک جوہڑ سے پانی پیتے تھے۔اس کی عورتیں اٹھنیوں اور روپوں کے لیے مرچوں کے کھیت میں جھکے جھکے دوہری ہو گئی تھیں۔ان کے مردوں کے بدن میں لہو، مٹیالا پانی بن کر رگوں سے گزرتا تھا___ تمام فریادیں بے کار تھیں دادرسی کرنے والے عرش پر بیٹھے تھے اور ڈھاڑکی، تھری اور لاڑ سے واقف نہ تھے۔'' [۴۷]

زاہدہ حنا نے معاشرے کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھا ہے۔صرف طبقہ اشرافیہ ہی نہیں بلکہ کوڑھ زدہ فقیر بھی اُن کے مشاہدے سے بچ نہیں سکا۔وہ بتاتی ہیں کہ محبت کا لافانی جذبہ صرف صاف ستھرے، صحت مند لوگوں سے مخصوص نہیں بلکہ Aids کا شکار بھیک مانگنے والا شخص بھی اس جذبے کی معراج تک پہنچ سکتا ہے۔ابن ایوب اپنی محبت، اپنی زبیدہ کے علاج کے لیے بھیک سے مانگی ہوئی رقم کا روپیہ روپیہ جمع کرتا اور خود پر پیٹ بھر کر کھانا حرام سمجھتا ہے۔'ابنِ ایوب' کا موضوع محبت ہے۔اسی طرح کا موضوع کرشن چندر جو اُردو کے نامور افسانہ نگار ہیں، کے ہاں ملتا ہے۔ کچرا بابا، کالو بھنگی کا موضوع یہی ہے کہ معاشرے کے نچلے افراد یا طبقے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار عام لوگوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہیں۔

ادب کا معاشرے سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ادیب کی تخلیقات میں زندگی اور اس سے جُڑے معاشرتی مسائل کے مختلف پہلوؤں کا ایک عکس ہوتا ہے۔آج دنیا گلوبل ویلج بن گئی ہے۔ ساری دنیا کے لکھنے والے ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔کوئی بھی ادیب ایسا نہیں جو دنیا میں جاری انسانیت کی توہین، ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز نہ اٹھا رہا ہو اور جس طرح پیغمبر، دیوی دیوتا انسان کو اچھی راہ پر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اِسی طرح ادیب بھی اپنی تحریروں سے اُجالے کی طرف اپنے معاشرے کو لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔موجودہ دور میں یہ ادیب پر بھاری ذمہ داری بھی ہے اور زاہدہ حنا اِس ذمہ داری کو اپنے افسانوں میں بخوبی نبھاتی نظر آتی ہیں۔

زاہدہ حنا کا نسائی اور تانیثی شعور

عورت اور مرد کا ساتھ ہی معاشرے کی تکمیل کرتا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی کائنات کے اُدھورے پن اور نسلِ انسانی کے اختتام کا اشارہ ہے۔ ان دونوں کا ساتھ ہی صحت مند معاشرے کی بقاء کا ضامن ہے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں مرد کو فاتح اور عورت کو محکوم سمجھا گیا۔ کبھی مذہب، کبھی اخلاقی تقاضے، کم عقلی اور آدم کی پسلی سے نکلنے کو جواز بناتے ہوئے اس کی ذات کی اس حد تک نفی کی گئی کہ اس کی گواہی کو بھی پورا تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یعنی اسے مکمل ہونے کا کبھی موقع ہی نہیں دیا گیا۔

ادب معاشرتی رویوں، خیالات و اقدار کا عکاس ہوتا ہے۔ تخلیق کار اپنی تخلیقات کا مواد اُسی دھرتی سے لیتا ہے جہاں وہ سانس لیتا ہے۔ اس لیے ہر دور میں عورت کی جو حیثیت رہی ہے اس کا عکاس اُسی عہد کا ادب ہے۔

عورت کو ماں، بیٹی، بیوی، طوائف، تنہا عورت، جوان عورت، پاکیزہ لڑکی، گنوار مگر خوبصورت عورت، چڑیل، ڈائن، جادوگرنی، علامت جنس، حوا، مریم کے طور پر ادب میں پیش کیا گیا، لیکن یہ عورت کا حقیقی تصور نہیں بلکہ مرد کا تصورِ عورت ہے۔ وہ عورت کو اسی طور پر دیکھنا چاہتا یا عورت کا اسی طور ادراک کرتا ہے۔ گویا یہ وہ عورت ہے جو مرد کے مخصوص ذہنی، جذباتی، طبقاتی، جنسی میلانات کی تخلیق ہے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مرد عورت کے اسی روپ کو 'آفاقی' تصور کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام ناموں میں عورت کے جنسی اور ثقافتی فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہ کسی ایک انسان کے عورت کو دبانے یا محکوم رکھنے کے تصورات نہیں بلکہ حقیقت میں تاریخ و ثقافت میں صدیوں سے رائج تصورات اور اقدار اس کی پشت پر کام کر رہی ہیں جس میں مرد کو ہمیشہ 'برتر' اور عورت کو 'کمتر اور کمزور' تصور کیا جاتا ہے۔ اس لیے مرد تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات

میں اسی تعصب کے مظاہرہ کرنے پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی کیونکہ ان کی تربیت ہی اس نہج پر کی گئی ہے۔

عورت کو کبھی اتنا موقع ہی نہیں دیا گیا کہ وہ جو سوچتی، سمجھتی، محسوس کرتی ہے اس کو معاشرے کے سامنے اپنی تخلیقات کے ذریعے پیش کرے۔ اگر عورت کو اتنی آزادی دی جاتی تو تبھی وہ ایک مستند ذات کے طور پر ادب میں سامنے آتی، لیکن متعدد لسانی، تاریخی، تہذیبی، اخلاقی، فلسفیانہ، مذہبی، سیاسی و معاشرتی عوامل عورت کے شعور ذات کے حصول راہ میں رُکاوٹ بنے رہے اور ان تمام عوامل پر مرد کا کنٹرول تھا۔ اس لیے مرد ادب میں بھی ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عصمت جمیل لکھتی ہیں:

> ''زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب میں بھی ایک طویل عرصے تک مرد ادیبوں کو برتری حاصل رہی۔ عورت کے بارے میں وہی تصورات مقبول ہوتے رہے جو مرد اہلِ قلم اپنے افکار میں پیش کرتے رہے۔ اس لیے یہ تحریریں عورت کے حقیقی مسائل کو پیش نہیں کرسکیں بلکہ عورت کی ظاہری صورت اور مرد کی اس سے وابستہ توقعات کو پیش کرتی رہیں۔'' [۴۸]

لیکن اب صورتِ حال تبدیل ہورہی ہے۔ عورت کی ذات ایک ایسا معمہ ہے جسے کوئی بھی مرد حل نہیں کرسکتا اور صرف عورت ہی وہ واحد ہستی ہے جو اپنے وجود اور شعورِ ذات پر روشنی ڈال سکتی ہے اور نسائیت کی تحریک عورت کے شعورِ ذات کی پیداوار ہے۔ Feminism عورت سے متعلق تحریک ہے جو عورت کو مرد کی نگاہ سے نہیں بلکہ اس کی ذات کی شناخت کا سوال اُٹھاتی ہے۔ یہ عورت کے حقوق کی اور اسے بحیثیت الگ وجود کے تسلیم کرنے کی بات کرتی ہے۔ اسی تحریک کے باعث ادب میں عورت کو صحیح طور پر نمائندگی دی گئی۔ یہ تحریک عورت کی بے زبان اور گونگی طاقتوں، صلاحیتوں، پوشیدہ خواہشات اور دبی ہوئی خصوصیات کے لیے آواز بلند کرتی اور اس کی ذات کا تعین رشتوں سے نہیں بلکہ اس کی خصوصیات کے حوالے سے کرنے کی بات کرتی ہے۔ اسی تحریک کی وجہ سے ادب میں عورت کا وہ تصور آیا جو صرف عورت ہی سے مخصوص ہے کیونکہ مرد اور عورت کا بنیادی طور پر فرق سوچ کا ہی ہے۔ عورت کی سوچ مرد کی نسبت بہت زیادہ گہری

ہوتی ہے اور یہ گہرائی اس کی ذات میں اُتری ہوتی ہے جسے مرد نہیں سمجھ سکتا۔

زندگی جو عورت اور مرد کی شراکت کا نام ہے۔ اس میں ان دونوں کے لیے الگ الگ دائرہ کار متعین کر دیئے گئے۔ عورت جو دنیا کی نصف آبادی سے بھی زیادہ ہے کبھی اس قابل نہیں سمجھی گئی کہ اپنے وجود کے لیے آواز بلند کرے۔ Feminism نے عورت کے لیے آواز اُٹھائی۔ اس تحریک کی ابتداء مغرب سے ہوئی، مگر ساری دُنیا کے ادب پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔

اس تحریک کا نقطۂ آغاز ۱۷۷۹ء انقلابِ فرانس ہے جب عورت نے اجتماعی سطح پر پہلی دفعہ اپنی آزادی کے مطالبے کی جرات کی۔ انقلاب فرانس نے کچھ عرصہ بعد ۱۷۹۲ء میں میری وولسٹن رافٹ (Mary Wollstone Craft) نے "A Vindication of the Right of Woman" تحریر کی، جس میں عورتوں کی تعلیم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یعنی مردوں کی برابری کا مطالبہ عورتوں کی طرف سے کیا گیا۔ اس کے بعد یہ تحریک چلتی رہی۔ بیسویں صدی برق رفتار تبدیلیوں کی صدی ہے اس میں Feminism نے تیز رفتاری کے ساتھ فکری اور عملی میدان میں پیش رفت کی۔ سیمون دی بوار (Semone De Beauvior) کی "The Second Sex"، ۱۹۴۹ء میں پہلی دفعہ عورت کی حقیقت اور اصلیت کی بازیافت کی کوشش کی گئی۔ کشور ناہید نے اس کا ترجمہ ''دوسری جنس'' کے نام سے اُردو میں کیا۔

پاکستان میں بھی خواتین نے اس تحریک کو شروع کیا۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، فاطمہ حسن، عاصمہ جہانگیر، خالدہ حسین، زاہدہ حنا، عطیہ داؤد، شاہدہ حسن وغیرہ نے عورتوں کے حق کے لیے ادب کے ذریعے آواز اُٹھائی اور عورت کا حقیقی روپ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ وہ عورت جو ادبی تواریخ اور تخلیقات میں حاشیے پر تھی اُسے زندگی کے مرکزی دھارے سے ملا کر ادب میں نئے انداز سے متعارف کرایا اور عورت کے حقوق کی جنگ لڑی۔ اس کے ساتھ ہونے والے مظالم اور ناانصافیوں کو معاشرے کے سامنے تخلیقات کے ذریعے رکھ دیا تاکہ اس آئینے میں مرد اپنا مکروہ چہرہ دیکھ کر خود کو بدلنے کی کوشش کرے کیونکہ اب وہ وقت ہے کہ عورت سے ازل سے روا رکھے جانے والی سوچ کو بدلنا ہوگا۔ اب ادب میں عورت نے اپنی الگ حیثیت کو اس طرح تسلیم کرایا ہے کہ خالدہ حسین لکھتی ہیں:

''یہ صفحات اشاریہ ہیں کہ دُنیا کی نصف (کچھ زیادہ) آبادی کیا سوچتی

اور محسوس کرتی ہے وہ کس دُنیا میں زندہ ہے اور کس دنیا کے خواب دیکھتی ہے۔عورت کے خون کا رنگ مرد سے مختلف نہیں نہ ہی ایک پسلی کم مگر اس کا زندگی کے بارے میں وژن ضرور الگ اور ممتاز ہے۔اس سلسلے میں اسے رعایتی نمبر دینے کی بھی ضرورت نہیں۔بس اتنا دیکھئے کہ اگر عورت کو نکال دیا جائے تو دنیائے ادب کتنی مفلس، کس قدر قلاش رہ جاتی ہے۔" [۴۹]

زاہدہ حنا کا ایک مقدم تخلیقی حوالہ Feminism بھی ہے۔وہ عورت ذات اور اس کے حقوق کے لیے ہمیشہ سے سرگرم نظر آتی ہیں۔اُنہوں نے نہ صرف افسانے بلکہ کالم، مضامین اور مقالات بھی عورت کی حمایت میں قلمبند کیے ہیں۔وہ عورت جسے ادب میں کبھی نمایاں مقام نہیں دیا گیا زاہدہ حنا کے ہاں بحثیت انسان، ایک مکمل وجود کی حیثیت میں سامنے آتی ہے۔جس میں فکر، ادراک اور شعور ہے اور اس فکر کے اظہار میں وہ آزاد بھی ہے۔

ادب میں طویل عرصے تک عورت کو ضرورت کے ساتھ مشروط کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے، لیکن اب عورت نے خود کو تصورات کی بجائے حقیقت میں ادب میں پیش کیا ہے۔اب ایک تعلیم یافتہ اور باشعور عورت ادب میں نظر آتی ہے۔زاہدہ حنا کے ہاں عورت سوچنے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔وہ اپنی پابند اور زنجیروں میں مقید ذات کو آزادی دلا کر وسعت کی متقاضی ہے۔زاہدہ حنا عورت کی اس تڑپ اور بے چینی کو 'سمندر' کے استعارے سے بار بار اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔سمندر میں بلا کا اضطراب، بے چینی، گہرائی اور وسعت پائی جاتی ہے اور اس اضطراب میں زاہدہ حنا کو عورت کے وجود میں موجود بے چینی سے مماثلت نظر آتی ہے۔"آنکھوں کے دیدبان" میں لکھتی ہیں:

"یہ سمندر جو شفاف دیوار کے اس پار دور تک سویا ہوا ہے۔کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سویا ہوا سمندر کروٹ بدل کر اپنی کہنیوں کے سہارے اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔آج کی رات بھی ایسی ہی رات ہے آج شام ہی سے سمندر کہنیوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن جانے کیا چیز اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے____ مجھے معلوم ہے کہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ تمام زنجیریں توڑ کر اُٹھ بیٹھے گا اور میرے پاس چلا آئے

گا۔''[۵۰]

زاہدہ حنا عورت کے لیے جس قدر آزادی کی متقاضی ہیں ہمارے معاشرے میں اس کا ملنا بہت مشکل ہے، لیکن زاہدہ حنا پُر اُمید ہیں کہ ایک دن ایسا ضرور ہوگا جب عورت کو آزادی ملے گی۔ وہ اپنے افسانوں صرصر بے اماں، شیریں چشموں کی تلاش، زرد ہوائیں، زرد آوازیں میں سمندر کے حوالے سے عورت کی ذات کو بیان کرتی ہیں۔

زاہدہ حنا کے ہاں عورت کا عشق و محبت کا وہ روایتی تصور نظر نہیں آتا جو مرد ادیبوں نے پیش کیا ہے۔ عورت کا عشق مرد سے بالکل اُلٹ ہوتا ہے۔ عورت وصل سے ملنے والی لمحاتی خوشی سے نہیں بلکہ عشق کی تڑپ اور بے چینی سے عشق کرتی ہے۔ زاہدہ حنا اپنے افسانے ''ساتویں رات'' میں عورت کی نفسیات کو واحد متکلم کے بیانیے میں بہت خوبصورتی اور اَچھوتے انداز سے بیان کرتی ہیں۔ عورت عشق میں غرور کرنا پسند کرتی ہے۔ وصال کے چند لمحوں کے لیے اپنی اَنا کو قربان کرنا خود اس کی اپنی ذات کی موت ہے۔ اس لیے وہ فراق کو ترجیح دیتی ہے۔

> ''یہ خیال آتے ہی میرا دل بیٹھے لگتا ہے اس شخص کا فراق مجھے کس قدر عزیز رہا ہے جبکہ وصال تو ایک ایسی شفاف ندی ہے جسے دیکھو تو اس کی تہہ میں بچھے ہوئے سنگریزے بھی صاف نظر آتے ہیں۔ یہ ندی اپنے اندر کوئی رمز نہیں رکھتی اور فراق کائنات کے عمیق ترین سمندر کی مانند ہے جس کی گہرائی تک کوئی نہیں پہنچا۔ میں بھی نہیں پہنچوں گی ____ مجھے سمندر میں اُترنا چاہیے جس کا سینہ فراخ ہے۔''[۵۱]

یہ زاہدہ حنا کا عورت کے بارے میں منفرد نقطۂ نظر ہے کیونکہ وہ خود ایک عورت ہیں اور اِسی وجہ سے عورت کی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے وہ اپنا نقطۂ نظر بھرپور طریقے سے اِس افسانے میں پیش کرتی ہیں۔ اس منفرد نقطۂ نظر کی تعریف مرزا حامد بیگ یوں کرتے ہیں:

> ''زاہدہ حنا کے افسانے 'ساتویں رات' میں آج کی انٹیلکچوئیل عورت کا تجربہ ہے جس کے نزدیک وصال شفاف ندی ہے جس کے اندر کوئی رمز نہیں۔ اس کے مقابلے میں فراق جان لیوا ہے لیکن اسرار سے پُر سمندر کی مانند خوبصورت ہے۔ اس عورت کا چناؤ فراق ہے۔''[۵۲]

عورت ذات کے متعلق اتنے خوبصورت انداز سے صرف ایک عورت ہی سوچ سکتی اور اپنی تحریروں کا موضوع بنا سکتی ہے۔ ہمارے مرداساس معاشرے میں عورت کی تربیت اس نہج پر کی جاتی ہے کہ وہ مرد کی نسبت انتہائی کمزور اور اپنے وجود کی شناخت کے لیے مرد کے حوالے کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر عافیہ سیدہ اپنے مضمون ''خواتین کے بارے میں تعلیمی مغالطے'' میں لکھتی ہیں:

''یہ تصور تو ہمارے عام یقین کا حصہ ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں کمزور ہیں اس لیے وہ مردوں کے مقابلے میں کمتر بھی ہیں۔ ان کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داریاں انہیں ایثار اور قربانی ہی سکھاتی ہیں اسی لیے عورت کا منصب گھر اور اس کے مناسبات سے متعین کر دیا گیا۔ اس کا فرض خدمت اور اطاعت ٹھہرا جبکہ مرد کے لیے خدمت کروانا اور اطاعت گزار رکھنا مخصوص سمجھا جانے لگا۔'' [۵۳]

زاہدہ حنا اپنے افسانے ''آنکھوں کے دیدبان'' میں معاشرے کی اسی مروجہ روش کو بیان کرتی ہیں کہ بچوں کی تربیت میں ماں کا ہاتھ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں اپنی بیٹیوں کی گھٹی میں ایثار، قربانی اور صبر شامل کر دیتی ہے جس کی وجہ سے عورت اپنی ذات کے لیے آزادی چاہ کر بھی حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے لیے زندگی گزارنے کا ایک مخصوص اور محدود دائرہ کار متعین کر دیا گیا ہے جس سے رہائی اس کے لیے ممکن نہیں۔

''مجھے سمندر کا انتظار ہے لیکن وہ مجھ تک نہیں آتا وہ اپنی کہنیوں کے بل اُٹھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے اور پھر تھک کر لیٹ جاتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ اُٹھوں اور اس کی طرف سفر کروں، لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں تو میرے پیر نہیں اُٹھتے اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا نچلا دھڑ تو گرد باد کا ہے اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں قید کر دیا گیا ہے۔ باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرہ دیتی ہیں اور ان کی چمک میرے اعصاب کو سُلا دیتی ہے ___ میں حصارِ ذات سے باہر کیسے آؤں کہ میری آنکھیں میرے دیدبان ہیں۔'' [۵۴]

ایک وقت تھا کہ جب یورپ میں کلیسا کی حکمرانی تھی۔ گلیلیو کے نظریات کو مذہب سے

ٹکراؤ کا نام دیا گیا تھا کہ جس نے اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر کہا تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے جبکہ کلیسا کا اصرار تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے۔ جلد ہی اہلِ یورپ کو احساس ہو گیا کہ ریاست کے معاملات میں کلیسا کی بڑھتی ہوئی مداخلت ترقی کے تمام امکانات مسدود کر دے گی تعلیم یافتہ اور باشعور قومیں بہت جلد حساس معاملات کا ادراک کر لیتی ہیں لہٰذا جونہی یہ احساس یورپ میں جاگا تو کلیسا کے اختیارات محدود ہونا شروع ہو گئے اور یہیں سے یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوا، لیکن ہم وہ بدقسمت قوم ہیں جو مذہبی انتہا پسند گروہوں کی اپنے اپنے مفادات کی خاطر ابھی تک سرپرستی کر رہے ہیں۔ ہر کوئی قرآن وسنت کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے اور دوسروں کا حق ہتھیانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ زاہدہ حنا اس بات کا نوحہ کرتی نظر آتی ہیں کہ مذہب کے نام پر سب سے زیادہ جو طبقہ استحصال کا نشانہ بن رہا ہے۔ وہ ''عورت'' ہے مرد حضرات جانے کیوں اس مخلوق سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اس کو بحیثیت انسان کے بھی حقوق دینے کے روادار نہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے عورت کو دیگر مذاہب کے مقابلے میں سب سے زیادہ حقوق دیئے ہیں، لیکن مذہب کے ٹھیکیداروں نے مذہب کے نام پر اس کا خوب استحصال کیا ہے۔ ۱۹۵۶ء کے پہلے آئین میں عورتوں کے ووٹ کے حق اور ۱۹۶۱ء میں عائلی قانون کے اجراء پر مولوی حضرات شدید برہم ہوئے کیونکہ اس میں شادی کے لیے لڑکیوں کی کم سے کم عُمر مقرر کی گئی دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے تحریری اجازت، نکاح اور طلاق کا اندراج اور نکاح میں عورت کے طلاق کے حق کی شق شامل کی گئی۔ طلاق کی صورت میں بچوں کی تحویل اور نان ونفقہ کے معاملات نسبتاً عورتوں کے حق میں ہوئے، مولوی حضرات نے عورتوں کو ملنے والے اس شرعی حق کی بہت زیادہ مخالفت کی۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> ''عائلی قوانین نے مولویوں کے اندر شدید غیظ وغضب کو جنم دیا اور پاکستانی عورت الزامات اور پراگندہ ذہنی کی ایک نئی آزمائش میں ڈالی گئی ایوب خان کا زمانہ ہو یا آج کا دور مولویوں کے اس طیش کا سبب ایک ہی رہا ہے، انہیں اس بات سے خوف آتا ہے کہ عورت جو سماج کا کمزور اور کچلا ہوا طبقہ ہے اگر وہ اور اس کے معاملات ان کے دائرۂ

سے باہر نکل گئے تو ان کی روزی روٹی اور حلوے مانڈے کا کیا ہوگا۔'' [۵۵]

ان کے بعد ضیاء دور کو عورت کے لیے اندھیری رات قرار دیا جاسکتا ہے جسے مذہب کی آڑ میں عورتوں پر مُسلط کیا گیا اس دور میں سیاسی شعور رکھنے اور سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے والی خواتین کو پاکستانی جیلوں میں شدید جسمانی تکالیف دی گئیں اس حوالے سے مظہر عباس لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں جاگیردارانہ سماج اور آمریت نے عوام کے اندر عورت کے حقوق کے حوالے سے شعور بیدار ہی نہیں ہونے دیا۔ضیاء الحق کا مارشل لاء پاکستانی عورت کے لیے بدترین دور ثابت ہوا۔۱۹۸۴ء میں قانونِ شہادت کے تحت اس کی گواہی کو آدھا کر دیا گیا۔نویں ترمیم کے قوانین کے تحت زنا اور عصمت دری کی تفریق ختم کر دی گئی فوجی آمریت نے اسلام کی آڑ لے کر بدترین مردانہ شاونزم کا مظاہرہ کیا۔'' [۵۶]

زاہدہ حنا سیاسی طور پر تحریر و تقریر پر لگنے والی پابندیوں کے باوجود قلم کے ذریعے ہر دور میں عورت کے حق کے لیے آواز اُٹھاتی رہی ہیں۔اپنے افسانے ''زمین آگ کی، آسماں آگ کا'' میں زاہدہ حنا نے مذہب کے نام پر ''بہشتی زیور'' جیسے اس گہنے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جسے عورتوں کے گلے کا طوق بنا دیا گیا ہے اور مرد کے لیے یہ ایک بہت بڑا ہتھیار ہے کیونکہ ایک مرد نے خود کو اور اپنے جیسے دیگر مردوں کو ہر طرح کی آزادی اور حاکمیت دینے کے لیے اسے تصنیف کیا ہے۔اس افسانے کی کہانی مشہور شاہ بانو طلاق کیس کی بنیاد پر زاہدہ حنا نے کمال مہارت سے بنی ہے۔اس افسانے میں سماج اور مذہب کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے دو غلے رویوں کو بے باکی اور سچائی کے ساتھ اس طرح زاہدہ حنا بیان کرتی ہے کہ کہانی کی خوبصورتی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ دُلارے میاں جو وکیل ہیں اپنی بیوی کو اس بہشتی زیور کی وجہ سے اتنی اجازت بھی دینے کے قائل نہیں کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کتاب پڑھ سکے۔دیر سے شوہر کے گھر آنے پر تھوڑی دیر کے لیے سو جائے یا شوہر کی بے راہ روی پر باز پُرس کر سکے کیونکہ مذہب، شوہر سے سوال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔اس لیے زاہدہ حنا شہنشاہ بیگم کے کردار کے ذریعے مذہب میں عورت کے مقام کے متعلق اپنے نظریات یوں بیان کرتی ہیں:

''وہ پہلی رات تھی جب اُنہیں یقین ہوگیا کہ عورتوں کی نجات کا کوئی نسخہ آسمان سے زمین پر نہیں اُتارا گیا ہے تمام کتابیں، تمام تحریریں، تمام اقوال اس لیے ہیں کہ مردوں کو اس سے آگاہ کیا جائے کہ وہ دنیا میں ہی عورتوں کو کس طرح جہنم کے ساتویں درجے میں رکھ سکتے ہیں۔'' [۵۷]

اس افسانے میں زاہدہ حنا بطور افسانہ نگار اپنے کمال تک پہنچتی نظر آتی ہیں۔ وہ شاہ بانو کیس کی تمام صورتِ حال پر مبلغ یا تبصرہ نگار بنے بغیر اپنی بات قارئین کے سامنے رکھ کر اُنہیں نتائج اخذ کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی ہیں۔ اس افسانے کے متعلق ڈاکٹر فاطمہ حسن یوں رقمطراز ہیں:

''یہ کہانی نسائی شعور کی بہترین مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ کہانی میں جگہ جگہ ایسے مقامات آئے ہیں جو روایت اور مذہب کا سہارا لے کر عورت کے استحصال کے مروج رویے کو کتابوں کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں مگر کہانی پر دستاویز کی چھاپ نہیں لگتی، نہ ہی لکھنے والی کوئی سیاسی یا سماجی کارکن بن کر نعرہ لگاتی نظر آتی ہے۔ زاہدہ حنا نے اس کہانی میں بڑی چابکدستی سے معاشرتی سچائیاں پیش کی ہیں۔'' [۵۸]

زاہدہ حنا بہت جرأت منداور باشعور ادیبہ ہیں۔ وہ مذہب کی آڑ میں عورتوں پر ہونے والے ظلم کے سخت خلاف ہیں۔ وہ عورتوں کے حقوق کے لیے انتہائی سرگرم رہتی ہیں۔ اُن کا کمال ہے کہ وہ مذہب اور اس حوالے سے اہلِ عرب کی اندھی محبت یا عقیدت میں گرفتار نہیں۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہیں اور حقائق کو اپنی تحریروں میں بیان کرتی ہیں کہ اہلِ عرب عورت کو کیا حیثیت اور مقام دیتے ہیں۔ مذہب کی آڑ میں عورتوں پر کیا کیا مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ ''جل ہے سارا جال'' میں پہلی دفعہ اس حساس موضوع کو کسی ادیبہ نے موضوع بنایا ہے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

''اِرم کو شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ کسی عرب شاہ زادے کی بیوی بننا کوئی ہنسی ٹھٹھول نہیں۔ وہ اس کی منکوحہ تھی اور عرب شہزادے کے بقول وہ اس

کی کھیتی تھی اور کھیتی اس بات کی مجاز نہیں کہ وہ ہل چلانے والے کو اس بات
پر ٹوکے کہ ہل کھیتی کے آغاز سے چلایا جائے یا اختتام سے۔'' [۵۹]

زاہدہ حنا نے جس جرأت اور بے خوفی سے مذہب کے نام پر عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اُٹھائی ہے وہ صرف اُنہیں کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد، زاہدہ حنا کی جرأت کو داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جل ہے سارا جال بے حد جرأت مندانہ افسانہ ہے۔ ایسی صورتِ حال میں جب پاکستان میں بیشتر گھروں میں یہ عقیدہ بن چلا تھا کہ عرب ان کے رازق اور پالن ہار ہیں اور ان کے التفاقات کو دیرپا بنانے کی ایک صورت ان کی مرغوبات نسوانی کی پاکستان سے فراہمی ہے۔'' [۶۰]

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مرد اور عورت کی تفریق کا قائل نہیں اور مساوات کا درس دیتا ہے، لیکن پاکستانی معاشرے میں اسلام کو عورت ذات کو نیچا دکھانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مذہب کے نام پر عورتوں کو گھروں میں مقید کر دیا جاتا ہے۔ ان پر تعلیم کے دروازے بند کیے جاتے ہیں۔ ان کی ذہانت جو کسی بھی طور پر مردوں سے کم نہیں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ اس ظلم کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ عورت کے لیے گھر میں رہنا ہی شریعت کا فیصلہ ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانے ''نیند کا زرد لباس'' کی پروین جس کی عمر محض تیرہ برس ہے لیکن اس کے سوالات اس کی ذہانت کے عکاس ہیں۔ اس ذہانت کے ضائع ہونے کا دُکھ زاہدہ حنا یوں کرتی ہیں:

''چٹیل پہاڑوں اور چلغوزے جیسے ذہن رکھنے والوں نے ہماری کیسی کیسی ذہانتیں ضائع کر دیں۔'' [۶۱]

زاہدہ حنا اس بات کا افسوس کرتی ہیں کہ اگر ان ذہانتوں کو استعمال کیا جاتا تو کتنی ترقی ہماری قوم کر سکتی تھی اور دنیا میں باعزت مقام حاصل کر سکتی تھی، لیکن صد افسوس کہ تعلیم کی کمی اور مذہب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والے اِس بات کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر تیار ہی نہیں ہیں۔

جنگ زاہدہ حنا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ جنگ کو اس لیے موضوع بناتی ہیں کہ جنگ زدہ علاقوں کے لوگوں کی تکالیف اور مصائب کو بیان کر سکیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جنگ کے نتیجے

میں شہر اور ملک تو تباہ ہوتے ہی ہیں، لیکن اس تباہی میں سب سے پہلا اور بڑا خطرہ عورت کے وجود کو ہوتا ہے۔ یہ تباہی سب سے پہلے اس کے وجود پر گزرتی اور پھر آگے کو سفر کرتی ہے۔ عورت کی اس بدنصیبی کی تائید ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے حوالے سے اس طرح کرتے ہیں کہ

''جنگ کے بعد جو فتح کی خوشخبری بھیجی جاتی تھی اس میں خاص طور سے یہ خبر ہوتی تھی کہ کتنی عورتیں گرفتار ہوئیں اور کس کو کتنی ملیں۔ عام طور سے خوبصورت عورتیں حکمرانوں، جرنیلوں اور امراء کے لیے ہوتی تھیں۔ باقی عام سپاہیوں میں تقسیم ہو جاتی تھیں۔ مثلاً چچ نامہ میں ہے کہ سندھ کی فتح پر صرف اروڑ شہر میں محمد بن قاسم نے تیس ہزار غلام اور کنیزیں حاصل کیں کہ جن میں سے تیس لڑکیاں راجاؤں کی بیٹیاں تھیں، کنیزیں بننے کے بعد یہ عورتیں تاریخ سے غائب ہو جاتی ہیں اور پھر یہ تذکرہ نہیں ملتا کہ ان کا کیا ہوا۔'' [۶۲]

یعنی وہ محمد بن قاسم جو ہماری تاریخ میں ایک عورت کی مدد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے لشکر لے کر برصغیر آیا اور فتوحات حاصل کیں۔ وہ محمد بن قاسم بھی عورتوں کی تعداد جاننے کا متمنی تھا۔ زاہدہ حنا یہ سوال کرتی ہیں کہ کیا مرد کی مردانگی، طاقت اور فتح کے اظہار کا صرف یہی طریقہ رہ گیا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ پوری دُنیا میں یہی طریقہ رائج ہے اور زاہدہ حنا تاریخ سے ثابت کرتی ہیں کہ جنگ کے زمانے میں اور بعد میں سب سے زیادہ تکلیف کا شکار عورت ہی ہوتی ہے۔ کنیزیں بنانے کے ساتھ ہی فاتح اقوام سب سے پہلے ان کی عصمت دری کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو اور موجودہ دور میں بھی یہی سب کیا جا رہا ہے۔

''ہر زمانے میں شہروں کا اور عورتوں کا ایک سا مقدر ہے۔ ہاں دُنیا بھر کی عورتوں کا مقدر ایک جیسا ہے لکھنو میں پردہ نشینوں کا حال کیا، نکل کے گھر سے چلی ہیں پا پیادہ۔ یہ بیبیاں بتاشوں کی طرح لال کرتی والوں اور خاکیوں میں تقسیم ہو رہی تھیں۔'' [۶۳]

عورتوں کی اسی محکومی اور بربادی پر خواجہ حسن نظامی ''بیگمات کے آنسو'' میں نوحہ

کناں نظر آتے ہیں۔

انسان کی سرشت میں قتل و غارت اور تباہی و بربادی ہے۔اس کو تبدیل کرنے کی کوشش آدم کے بیٹوں نے نہیں کی بلکہ اس کی شدت میں اضافہ ہی کیا ہے۔ایک وقت تھا کہ جنگ دو ممالک کے درمیان ہوتی تھی، لیکن اب جنگ حدود سے نکل کر پوری دنیا تک پھیل چکی ہے۔اب پوری دنیا جنگ و جدل کا میدان بنی ہوئی ہے جس میں انسان کو کہیں امان نہیں۔

ادب ہمیشہ منفی اقدار و روایات کی نفی کرتا اور اس کے خلاف علَم بغاوت بُلند کرتا رہا ہے۔زاہدہ حنا جنگ کی تباہ کاریوں کی تصویر کشی سے زیادہ افراد پر اس کے اثرات پر توجہ دیتی ہیں۔ آج پوری دنیا میں قتل و غارت اور بربادی کے نتیجے میں ہزاروں، لاکھوں بے گناہ افراد کا خون بہایا جارہا ہے اور کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔زاہدہ حنا دنیا بھر کی ماؤں کے حوالے سے جنگ کی مذمت کرتی ہیں۔وہ ماں جس کی اولاد جنگ کا ایندھن بنتی ہے وہ تکلیف کے کس درجے پر ہوتی ہے۔ زاہدہ نے کمال خوبصورتی سے اپنے افسانے ’بہ ہر سو رقص بسمل بود‘ میں بیان کیا ہے۔وہ ماں جو اپنی اولاد کو سوئی چبھتا دیکھ کر تڑپ اُٹھتی ہے۔وہ کس طرح اپنے لہولہو بیٹے کی لاش دیکھ کر تکلیف محسوس کرتی ہے۔اس کی تصویر کشی زاہدہ حنا نے بھرپور شدت کے ساتھ کی ہے۔اس امید پر کہ شاید قلم کی طاقت ور آواز کے ذریعے ظلم کرنے والے لوگوں کو ان کے ظلم کا احساس دلا سکیں۔لکھتی ہیں:

> ’’اس رات خانم خجستہ اور ان کے بیٹے ناہید نجف کے خواب میں آئے۔ آٹے سے بھرے ہوئے ایک بہت بڑے طباق کے گرد ایرج اور فریدوں کھڑے تھے، ان کے سینوں سے خون کی دھاریں نکل کر آٹے کو سُرخ کررہی تھیں۔خانم خجستہ نے اپنی ہتھیلیوں پر اپنے آنسوؤں کا نمک جمع کیا اس نمک کو خون آلود آٹے پر چھڑکا اور اسے گوندھنے لگیں۔پھر وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور لرزتی ہوئی انگلیوں سے غم و اندوہ کے بسکٹ بناتی رہیں۔رنج و الم کے سنبو سے تلتی رہیں ___ دنیا بھر کی مائیں جہنم کا ایندھن پیدا کرتی ہوئی، مفتوح بیٹوں اور مقتول بیٹوں کا سوگ مناتی ہوئی۔‘‘ [۶۴]

زاہدہ حنا کے ہاں ’ماں‘ سے مُراد کسی خاص خطے کی ماں نہیں بلکہ یہ لفظ پوری دُنیا کی

ماؤں کی علامت طور پر استعمال ہوا ہے۔ ان کے دُکھوں پر زاہدہ حنا نوحہ کنعاں ہیں۔ معدوم ابنِ معدوم، رقصِ مقابر، بہ ہرسودرقصِ بسمل بود، گُم گُم بہت آرام سے ہے میں مامتا کی تڑپ ملتی ہے۔

ہجرت زاہدہ حنا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ہجرت سے مراد صرف اپنی جگہ یا زمین چھوڑنا ہی نہیں بلکہ یہ اپنے آپ کے بے شناخت کرنے کا عمل ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی ہجرت کا عمل ہوا اس کے اثرات و ثمرات سب سے زیادہ عورتوں نے ہی سمیٹتے۔ عورت کی ذات اپنے اندر بہت زیادہ گہرائی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ دھرتی کی جڑیں بہت دور تک اس کے وجود میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ ہجرت کرنا مرد کی نسبت زیادہ اذیت ناک عمل ہے۔ اس عمل کو زاہدہ حنا نے اپنی والدہ کے وجود پر گزرتے ہوئے شدت سے محسوس کیا ہے اس لیے اُن کے ہاں ہجرت سے ملنے والا دُکھ خود اپنا تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ 'نا کُجا آباد' میں زاہدہ حنا نے کمال مہارت سے دکھایا ہے کہ عورت اپنی زمین سے جدائی پر کیا محسوس کرتی ہے۔

> ''میں سوچتی ہوں کہ وہ گھر اب کس حال میں ہوگا جس کی روشن پرچھائیں میرے وجود پر اپنا سایہ ڈالتی ہے۔ شاید اس کی چھتیں گر گئی ہوں اور دیواریں ڈھے گئی ہوں۔ اس کے آنگن اور کیاریوں میں خودرو پودے اور گھاس اُگ آئی ہو ___ لیکن وہ برباد اور ویران گھر میرے دل میں کس کس طرح آباد ہے، اس کے وجود کی خوشبو کی کیسی لپٹیں اُٹھتی ہیں۔ دھرتی کی مہک، مٹی کی خوشبو۔'' [۶۵]

ادب میں طویل عرصے تک عورت کو ضرورت کے ساتھ مشروط کیا گیا، لیکن اب عورت خود کو تصورات کی بجائے حقیقت میں ادب میں پیش کر رہی ہے اور اس کے مختلف رنگ، روپ قارئین کے سامنے آرہے ہیں جن میں جھوٹ یا دروغ گوئی کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ عورت کے انہیں رنگوں میں ایک روپ اپنے آدرش سے محبت بھی ہے۔ وہ اپنے نظریات کے لیے جان تو دے سکتی ہے مگر پیچھے نہیں ہٹتی۔ زاہدہ حنا کے ہاں آدرشی عورت نمایاں ہے جو نہ صرف اپنے حقوق بلکہ دوسروں کے حقوق کے لیے بھی کوشاں نظر آتی ہے۔ مثلاً 'تتلیاں ڈھونڈنے والی' کی سیاسی

قیدی' نرجیس'، 'پانیوں پر بہتی پناہ' کی ادیبہ 'کندن حسین' (جو بنگالی ادیبہ تسلیمہ نسرین ہے) 'ساتویں رات' کا متکلم کردار 'میں'، 'نیند کا زرد لباس' میں کابل کی بچی 'پروین'، 'منزل ہے کہاں تیری' کی 'عالیہ جعفر'، 'بہ ہر سو رقصِ بسمل بود' کی 'ناہید نجف'، 'گم گم بہت آرام سے ہے' کی 'گم گم'، 'جاگے ہیں خواب میں' کی 'لالہ دانیال'، 'ہوا پھر سے حکم صادر' کی 'نادرہ' اُن تمام افسانوں میں کوئی بھی عورت ایسی نہیں جو اپنے نظریات یا Committment سے بھاگے۔

مشہور داستان ''الف لیلیٰ'' کا داستانوی کردار 'شہرزاد' زاہدحنا کے ہاں بہت زیادہ ملتا ہے اور یہ کردار زاہدہ حنا کے افسانوں میں آج اور گذشتہ زمانے کے تقابل سے مستقبل میں عورت کے مقدر کے امکانات پر روشنی ڈال رہا ہے۔

زاہدہ حنا کے ہاں عورت کے کئی روپ ملتے ہیں، لیکن یہ تمام عورتیں تعلیم یافتہ، باشعور اور عقلمند ہیں۔ اگر کسی عورت کے پاس تعلیم نہیں بھی ہے تو بھی وہ باشعور اور ہوش مند عورت کے طور پر سامنے آتی ہے جو اپنے حقوق کے لیے آواز اُٹھاتی ہے کیونکہ ایک ناخواندہ اور جاہل عورت سے ہم اتنی بڑی ذمہ داری کی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ واضح طور پر ٹھوس دلائل دے کر اپنے لیے آواز بلند کرے گی۔

آج کے دور میں تعلیم یافتہ عورت کو اپنی ذات کے اندر اور باہر دونوں اطراف کے جہنموں کا سامنا ہے۔ تعلیم اپنے ساتھ آگہی اور اپنے حقوق کا شعور لاتی ہے جو اس معاشرے کو برداشت نہیں۔ ایک وقت تھا کہ عورت اپنی تخلیقات اپنے نام سے نہیں چھپوا سکتی تھی، لیکن اب ایسا نہیں وہ نہ صرف اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتی ہے بلکہ عورت کے ساتھ ہونے والے مظالم کو عورتوں کے سامنے رکھ کر اس مخلوق میں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس بھی اُجاگر کرتی ہے۔ حمیرا اشفاق عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''تعلیم کے فروغ نے خواتین کو آگے بڑھنے اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا سکھایا____ سوچ کی تبدیلی نے ادب پر بھی اثر ڈالا۔ اب عورت خود تعلیم، پردہ، حق خلع، طلاق، وراثت، تعددِ ازدواج کی خامیاں اور شریک حیات کے انتخاب میں آزادی جیسے موضوعات پر قلم اُٹھا رہی ہے۔ ادب کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کے ساتھ ساتھ عورت نے بھی خود کو

ڈھالا۔''[٦٦]

آج کے دور میں وہ حقیقی عورت جو ہمیشہ حاشیے پر رہی جس کے بارے میں مرد حضرات اپنے تخیلی خاکے کو ادب کا حصہ بناتے تھے۔خود اپنی زبان سے اپنے قلم سے اپنی ذات پر پڑے ہوئے پردے اُتار رہی ہے۔عورت کا وہ روپ جو حقیقی ہے اب دُنیا کے سامنے آ رہا ہے۔بیسویں صدی میں کسی حد تک عورت کو آزادی ملی ہے، لیکن باشعور اور تعلیم یافتہ افراد کے مطابق یہ کافی نہیں۔دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق عورتوں کو معاشرے میں زندہ اور باوقار مقام دیا جائے۔ اُسے پورا انسان سمجھا جائے۔پروفیسر وارث میر اِس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کی مسلمان عورت کی آزادی صرف یہی نہیں کہ وہ باورچی خانے کی ضروریات یا بچوں کے لیے کپڑا لتا خریدنے کے لیے بازار جا سکتی ہے وہ صحیح معنوں میں اُس وقت تک آزاد نہیں کہلا سکتی جب تک اپنے ملک کی سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کے اکثر معاملات اور مسائل میں بھی عملی طور پر حصہ نہیں لیتی۔''[٦٧]

آج کی عورت عملی زندگی میں جدوجہد کر رہی ہے اور ادیب خواتین تخلیق کار نہ صرف اپنے وجود پر، اپنے شعورِ ذات پر روشنی ڈال رہی ہیں بلکہ مظلوم خواتین کے حقوق کی جدوجہد بھی اپنے قلم کے ذریعے کر رہی ہیں۔وہ اس مرد اساس معاشرے میں برابری کی خواہاں ہیں۔یہ سب تانیثیت کی تحریک کا ہی کمال ہے کہ یہ اُمید کی جا رہی ہے کہ اب اس کے حالات تبدیل ہوں گے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا بھی بہت پُر اُمید ہیں۔لکھتے ہیں:

> ''تانیثیت کی تحریک، بیسویں صدی میں پروان چڑھی اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ اکیسویں صدی کے اختتام سے پہلے پہلے عورت ہر اعتبار سے مرد کے ہم پلہ ہو جائے گی___ معاشرتی اور قانونی سطح پر ہی نہیں فکری اور ادبی میدان میں بھی!''[٦٨]

زاہدہ حنا کا فلسفیانہ شعور

زاہدہ حنا کی شخصیت میں اور تحریر میں تصوف اور بغاوت کا عنصر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے اور یہ دونوں رنگ اُنہیں وراثت میں ملے ہیں۔ اُن کے پرکھ مرزا دلدار بیگ (خاکی شاہ) کے صاحبزادے مرزا عبدالستار بیگ سہرامی (زاہدہ حنا کے پردادا) نے 'ہنگامہ دار و گیر' میں ملنے والی مراعات سے لطف اندوز ہونے کی بجائے گوشۂ نشینی اختیار کی اور اپنی روح کا سکون سالکوں کے مسلک میں تلاش کرتے ہوئے تین جلدوں پر 'مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین' جیسی گرانقدر تصنیف تخلیق کی۔ تصوف کے ساتھ دوسرا رنگ بغاوت ہے۔ یوں انگریز دشمنی کی وساطت سے سامراج دشمنی اور باطن کے خلاف عملی جہاد کا درس زاہدہ حنا کو وراثت میں ملا ہے جو اُن کے مزاج اور فکری ساخت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ زاہدہ حنا کا فلسفہ 'زندگی' سے عبارت ہے۔ زندگی سے فرار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرنا نہیں۔ ان کے فلسفے میں چیلنج، انکار، جہاد، استقامت سب سے اہم ہے۔

زاہدہ حنا کے فلسفیانہ خیالات کا اظہار نمایاں طور پر ان کے افسانے 'شیریں چشموں کی تلاش' میں ملتا ہے۔ اس افسانے میں زاہدہ حنا کے افکار پر منصور بن حلاج کا رنگ چڑھا نظر آتا ہے۔ اگرچہ انہوں نے کہیں منصور بن حلاج کا نام نہیں لیا۔ جابر قوتوں کا انکار اور حق گوئی منصور بن حلاج کی نمایاں صفات تھیں۔ اس لیے آج تک ظالم و مظلوم کی جنگ میں منصور بن حلاج 'مظلوموں' کا ساتھی مانا جاتا اور مظلوموں کے لیے استقامت، تقویت اور ہمیشہ جہاد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس علامت سے زاہدہ حنا متاثر ہیں۔ لکھتی ہیں:

> ''اور ہاں، وائے ہو مجھ پر کہ اس کے بدن کو تقسیم کیا گیا اور اُس نے اپنا راستہ پالیا پر میری ذات بھول بھلیوں میں تقسیم ہوتی ہے اور تفریق ہوتی ہے میں گھٹتی ہوں اور گھٹائی جاتی ہوں اور پھر معدوم

ہو جاتی ہوں۔''[۶۹]

دانشوری اور مفکری میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جب صوفی انکار کی رہبری کو قبول کرتا ہے۔اسی رہبری کو منصور بن حلاج نے قبول کیا۔افسانے 'شیریں چشموں کی تلاش میں' زاہدہ حنا بھی اسی قبیلے کی فرد نظر آتی ہیں۔اس افسانے کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ 'عرفان وآگہی' کے سفر میں سیدھے راستے کی بجائے ٹیڑھے راستے کو پسند کرتی ہیں اور یہ راستہ 'عرفان' کا ہے اُس راستے پر چلتے ہوئے انہوں نے انکار کے علم کو اپنے وجود کی بلندیوں پر نصب کیا ہے۔

''اے سمندر، تو گواہ رہیو کہ میں ہر یقین اور گمان کو جھٹلاتی ہوں ـــــ جب میں ایڑھیاں اُٹھا کر انکار کے اس علم پر اُبھرے ہوئے نقطے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہوں تو عرفان کی آگ میری انگشت شہادت کو خشک ٹہنی کی طرح جلانے لگتی ہے۔یہ آگ میری تشنگی بجھاتی ہے اور میں جان لیتی ہوں کہ انکار میں نجات ہے اور انکار ہی میری آخری پناہ ہے۔''[۷۰]

زاہدہ حنا تصوف کی صرف قدیم روایات کی ہی دالدادہ نہیں بلکہ سالکوں کے مسلک کو یوں وسعت دیتی ہیں کہ اس قدیم روایت کو عصرِ حاضر سے ہم آہنگ کر کے ایک نئے انداز سے اسے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔'نا کجا آباد' میں یہ اندازِ یوں سامنے آتا ہے۔

''وہ نہیں جانتے کہ سلوک کی منزلیں عشقِ حقیقی میں مبتلا صوفیوں کے علاوہ عشقِ بشر میں گرفتار عارفوں نے بھی طے کی ہیں۔''[۷۱]

اسی عشق بشر میں مبتلا عارفوں میں مارکس اور اسی کے دوست فریڈرک اینگلز کا زاہدہ حنا شمار کرتی ہیں۔

''یہ وہ عارف تھا کہ جس کی شطحیات کچلے ہوئے مظلوم انسانوں کو حیاتِ نو کی نوید دینے والی تھیں ـــــ عشقِ بشر کی انتہاؤں کو پہنچنے والے اس جرمن نے اپنے ایک مراسلے میں جہلم کی اس بغاوت کے بارے میں لکھا تھا جن کے نتیجے میں مرزا دلدار بیگ اور ان کے ساتھیوں نے پھانسی پائی ـــــ وہ جرمن ایک یارِ وفادار بھی رکھتا تھا۔''[۷۲]

موجودہ عہد کے ادیبوں میں زاہدہ حنا کے ہاں فلسفیانہ طرزِ احساس سب سے نمایاں ہے کیونکہ زاہدہ حنا نے اس چیز کو خود پر طاری نہیں کیا بلکہ وراثت کی وجہ سے لہو میں کارفرما ہے اور اس کی کارفرمائی شیریں چشموں کی تلاش، ساتویں رات، آنکھوں کے دیدبان میں نمایاں ملتی ہے۔ یہ افسانے تصوف کے خاص رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔

زاہدہ حنا 'ساتویں رات' میں سلوک کی منازل کا ذکر منفرد انداز میں یوں کرتی ہیں:

''میں درویشوں کے اس حلقے میں شامل ہو جاتی ہوں جو دنیا کی لذتوں سے رشتہ توڑتا ہے اور لحظہ، رمقہ، ود، خلت اور حب کی منزلوں سے گزر کر عشق کی منزل تک پہنچتا ہے، لیکن وصل کی راہ سے مُنہ موڑ لیتا ہے۔'' [۷۳]

عشق کی منزل فراق ہے وصال نہیں کیونکہ زاہدہ حنا کے نزدیک وصال کی ندی میں کوئی رمز نہیں یہ تو صرف چند لمحوں کا کھیل ہے اور زاہدہ حنا ان چند لمحوں کی بجائے عشق کے اضطراب، بے چینی اور تڑپ کی قائل ہیں اور یہ نہ ختم ہونے والا عرصہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے لیے فراق کا چناؤ کرتی ہیں۔

فلسفے سے مراد عقل و دانش سے محبت ہے۔ فلسفہ زندگی کے مشکل اور غیر حل شدہ مسائل پر گفتگو کرتا ہے اور اس گفتگو پر عقل و فکر کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ فلسفے کا تعلق بنیادی طور پر خدا، روح، لافانیت، دُنیا اور ایسے دیگر مسائل سے ہے۔ فلسفیانہ سوچ ہمیشہ منطقی اور استدلالی ہوتی ہے۔ اسی سوچ کے زیرِ اثر زاہدہ حنا خدا، مذہب اور کائنات کے بارے میں سوالات اُٹھاتی اور غور و فکر کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔

ہمارا مذہبی عقیدہ ہے کہ خدا کی ذات یکتا و لاثانی ہے۔ اس جیسا پوری کائنات میں دوسرا نہیں ہے۔ سورۂ اخلاق مین کہا گیا ہے کہ

''آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اُس کا ہمسر ہے۔''

زاہدہ حنا فلسفیانہ انداز میں خدا کی تنہا ذات کی تنہائی پر غور کرتی نظر آتی ہیں۔ ایک ایسی طاقتور ذات جو پوری دنیا کی خالق اور مالک ہے، لیکن اس طاقت کی وجہ سے وہ کتنی تنہا ہے ذرا

سوچیں کہ کوئی بھی چیز جو یکتا ہو اور پوری دنیا میں اس جیسا کوئی دوسرا نہ ہو تو وہ پوری کائنات میں کس قدر اکیلی ہوگی۔ زاہدہ حنا کا خدائے واحد کے بارے میں منفرد نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''میں خداوند کے چہرے پر تنہائی کی اذیت ناک تحریر دیکھتی ہوں اور اس کے اِردگرد پھیلے ہوئے مُہیب اور تنہا سناٹے کی گونج سنتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے سامنے ایک آئینہ رکھ دوں اور اس طرح وہ جس نے کبھی اپنا چہرہ نہیں دیکھا اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھے اور اپنی دوسراہٹ سے باتیں کرے۔'' [۷۴]

زاہدہ حنا کا نقطۂ نظر بہت اہم ہے۔ ان کے نزدیک ہم مسلمانوں نے خدا کی ذات کے گرد تقدس اور خوف کا ایک حالہ سا بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے کوئی بھی اس ذات کے قریب جانے سے دہشت اور خوف محسوس کرتا ہے۔ زاہدہ حنا کے نزدیک دیگر مذہب کے خدا اتنے تنہا نہیں تھے خصوصاً ایران کے دیوی، دیوتا لوگوں کے بہت قریب تھے۔ لوگ ان کو لڑتے جھگڑتے اور عام انسانوں کی طرح کی حرکات کرتا سمجھتے تھے، لیکن ہم مسلم نے صرف خدا ہی کو نہیں بلکہ اس کے کلام 'قرآن پاک' کو بھی خود سے دُور اُونچے طاقوں میں برکت اور خیر کی علامت کے طور پر سنبھال کر رکھ دیا ہے۔ زاہدہ حنا کا یہ اندازِ نظر قابلِ ستائش ہے کہ خدا اور اس کے کلام کو خود سے قریب کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

زاہدہ حنا کے ہاں 'وقت' اور 'فنا' دو انتہائی اہم موضوعات ملتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے افسانوں میں ان کا ذکر کرتی ہیں۔ ان کے بیشتر کردار حالات و واقعات، وقت کی پناہ میں ہیں۔ زاہدہ حنا کے نزدیک وقت سے مراد کائنات کا تسلسل ہے جس میں زندگی رواں دواں ہے۔ اُن کے نزدیک دنیا ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ دنیا کے علاوہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس کو دوام ہو۔ وہ کائنات میں وقت کو بنیادی اہمیت دیتی ہیں کہ وقت یعنی کائنات کا تسلسل ازل سے جاری ہے۔ اس کی ابتداء اس واقعے سے ہوئی جب خدا نے 'کُن' کہا اور کائنات کی ابتداء ہوئی۔ انسانوں کے بنائے ہوئے دورانیے کی بجائے زاہدہ حنا کائنات کے تسلسل میں انسانوں کے 'فنا' ہونے کو موضوع بناتی ہیں۔ یہ فلسفیانہ نقطۂ نظر ہمیں قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔

زاہدہ حنا کے نزدیک وقت ایک دورِ مسلسل ہے۔ وقت کے ادب میں دو تصورات پائے جاتے ہیں (۱) دائروی(Linear) (۲) خطی(Cyclic) تمام قدیم تہذیبوں کی اساطیر میں وقت کا دائروی تصور ملتا ہے، لیکن مذہبی عقائد میں وقت کا خطی تصور پایا جاتا ہے۔ جس میں آغاز اور انجام کے دو نقطوں کے درمیان پھیلے ہوئے خط پر زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ زاہدہ حنا کے ہاں وقت کا خطی تصور ملتا ہے۔ جس میں وقت کی جبریت کا احساس ملتا ہے۔ اس جبریت کے زیرِ اثر 'فنا' کو زاہدہ حنا موضوع بناتی ہیں۔

ان کے فکری نظام میں دو چیزوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ایک وقت کا بہاؤ، دوسرا اس بہاؤ میں انسان کا فنا ہو جانا، لیکن فنا کے، موت کے بارے میں خوفزدہ ہونے کا رویہ زاہدہ حنا کے ہاں نہیں ملتا کیونکہ کائنات پر غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ فنا سے کوئی نہیں بچ سکا۔ انسان کا مقدر بالآخر خاتمہ ہی ہے۔ 'منزل ہے کہاں تیری' میں لکھتی ہیں:

''وقت نہ کہ دشمن جاں، نہ یار مہربان، ایک اتھاہ مقناطیسی کنواں جس کی طرف سب کھنچے چلے جاتے تھے ___ وقت ان پر ہنس رہا تھا جو اُسے گھڑیوں میں قید کرتے تھے۔ اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا۔'' [۷۵]

زاہدہ حنا کی تحریروں میں دو چیزیں وقت کے حوالے سے ملتی ہیں۔ ایک سفر جو مادی جسم کے حوالے سے گرد و پیش کے ماحول اور اس کے متعلقات سے ہوتا ہے۔ جس کے خاتمے کے ساتھ 'موت' واقع ہو جاتی ہے اور دوسرا سفر صدیوں سے نہیں بلکہ ہزاروں سال سے جاری وقت کے سفر کا شعور ملتا ہے۔ اس کی روانی تسلسل کے ساتھ ساتھ اس کی تباہی و بربادی کو زاہدہ حنا بڑے بلیغ انداز میں بیان کرتی ہیں۔

مظہر جمیل اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان کہانیوں میں وقت محض ایک جابر قوت ہی کے روپ میں نظر نہیں آتا جو انسانوں، قوموں اور تہذیبوں کی تقدیریں بنانے اور بگاڑنے کے مشغلے سے سرشار ہے اور محض حوادث و واقعات کا لامتناہی تسلسل بلکہ کائنات میں رواں دواں موجِ حیات کی صورت میں بھی جس کی نہ کوئی اور ہے نہ چھور۔ فنا اس کا مقدر ہے اور نہ خستگی اس کا مزاج۔ زندگی کا شعلہ جو ماند تو

پڑ سکتا ہے، لیکن بجھتا کبھی نہیں کہ اس کا دائمی طور پر بجھ جانا ہی شاید کائنات
کے خاتمے کا اعلان ہو۔'' [۷۶]

معدوم ابنِ معدوم، رقصِ مقابر، ہوا پھر سے حکم صادر، منزل ہے کہاں تیری، جاگے ہیں خواب میں، تتلیاں ڈھونڈنے والی، پانیوں پر بہتی پناہ اور دیگر افسانوں میں وقت اور فنا کا فلسفہ زاہدہ حنا بیان کرتی نظر آتی ہیں۔

زاہدہ حنا کی تحریروں میں زندگی، موت، روح، آخرت جیسے موضوعات پر سوالات نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ افسانے 'تتلیاں ڈھونڈنے والی' میں نرجس جس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے وہ اپنے چھوٹے سے بچے مہدی کو دیکھ کر سوچتی ہے:

''اس ننھے سے دل کا دھڑکتے رہنا ہی موت کے سامنے اس کی سب سے
بڑی جیت تھی۔ وہ اپنے بعد بھی رہے گی، لیکن روح کیا تھی اور اگر تھی تو
بدن سے نکل کر کہاں قیام کرتی تھی۔'' [۷۷]

اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ زاہدہ حنا کی سوچ پر فکر و فلسفہ غالب ہے۔ وہ مذہب کی اندھی تقلید نہیں کرتیں کیونکہ اگر مذہب کا رنگ ان پر غالب ہوتا تو اس سوال میں تیقن ہوتا کہ موت کے بعد روح جسم سے نکل جاتی ہے اور ایک نئی اور ابدی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے، لیکن یہ دلیل ان کو مطمئن نہیں کرتی۔ اس لیے وہ یہ سوچتی نظر آتی ہیں کہ 'فنا' کے بعد کیا ہوگا؟ وہ کائنات پر غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجے پر تو پہنچ گئی ہیں کہ انسان کا مقدر فنا ہے، لیکن اس کے بعد قیاس کی گئی باتوں کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتیں۔

اُردو فکشن میں بعض فکشن رائٹرز نے تو فلسفیانہ گفتگو کے لیے بعض کردار تخلیق کیے ہیں۔ وقت، حیات، موت کے بارے میں فلسفیانہ طویل گفتگو کی بجائے زاہدہ حنا چھوٹے کرداروں اور واقعات کے ذریعے سے زندگی کا فلسفہ بیان کرتی جاتی ہیں۔ ان کے ہاں سماج، تاریخ اور فلسفہ ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ تقریر کی بجائے زندگی کے بارے شعور کا احساس ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جو صوفیانہ طرزِ احساس ملتا ہے وہ اس بات کا عکاس ہے کہ موجودہ دور کے ادیبوں میں سب سے باشعور اور مضبوط آواز زاہدہ حنا کی ہے۔ چونکہ انہوں نے اس چیز خود پر طاری نہیں کی بلکہ وراثت کی وجہ سے لہو میں کارفرما ہے۔ وہ آج کے انسان کے

روحانی آشوب کی وجوہات کو تصوف میں تلاش کرتی ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر ناہید کی رائے بہت اہم ہے کہ

> ''اس وقت جدید انسان اپنی کھوئی ہوئی شخصیت کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ زاہدہ حنا نے جدید انسان کے اسی روحانی آشوب کی وجوہات تلاش کرنے کی جستجو میں وقت اور تاریخ کی مابعدالطبیعاتی اور صوفیانہ (Mystical) جہات کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔'' [۷۸]

ہجرت کا کرب

بیسویں صدی کو ہجرت کی صدی کہا جاتا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل، جنگِ عظیم دوم، ۱۹۴۷ء کی تقسیم، ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کا قیام، غرض اس پوری صدی میں انسان کو کسی طور قرار نہیں رہا۔ حالات کے سبب مسلسل حالتِ سفر میں رہا ہے۔ زاہدہ حنا آبادی کی ہجرت کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے نزدیک انسان جب اپنی اصل سے کٹ کر اپنی زمین سے ناطہ توڑ کر دوسری جگہ جاتا ہے تو وہ جگہ اسے ماسوائے اجنبیت کے اور کچھ نہیں دیتی۔ اس نقطۂ نظر کی وجہ یہ ہے کہ زاہدہ حنا خود اس عمل سے گزری ہیں اور ہجرت کا کرب اُنہوں نے اپنی ذات پر سہا ہے۔

اُن کی جنم بھومی 'سہسرام' ہے جہاں ان کے پُرکھ صدیوں سے آباد تھے۔ اس زمین سے زاہدہ حنا کو والہانہ عشق ہے۔ ۱۹۴۸ء میں والدین کے ساتھ کراچی منتقل ہوگئیں اور آج بھی وہیں سکونت پذیر ہیں، لیکن ان کا دل، اُن کی روح، سہسرام میں بستی ہے۔

تقسیمِ ہندوستان جس نے ہزار سال سے مروت اور رواداری کی بنیاد پر قائم معاشرے کو یکدم ختم کر کے ہندوستان کو دو الگ الگ ممالک میں تبدیل کر دیا۔ گو یہ نوزائیدہ مملکتیں جداگانہ دستور، نظامِ حکومت، مختلف سیاسی پروگرام رکھتی ہیں، لیکن معاشرتی اعتبار سے سرحد کے دونوں اطراف کم و بیش ایک ہی جیسا معاشرہ تھا۔ وہی لوگ، وہی معاشرت اور عادات و اطوار یہاں کے بسنے والے ایک دوسرے سے اس حد تک مماثلت رکھتے تھے کہ ان کی اجتماعی سائیکی بھی ایک جیسی تھی۔ علاقائی اثرات کے تحت تمدن و رسم و رواج بھی کم بیش ایک جیسے تھے، لیکن اب یہ دونوں معاشرے جداگانہ سیاسی وجود رکھتے ہیں۔ وہ لوگ جو صدیوں سے ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک تھے۔ وہ یکدم اجنبی بن گئے۔

اُردو ادب میں موضوعات اور اُسلوب کی سطح پر فسادات اور ہجرت کے مسائل ہی چھائے رہے کیونکہ فسادات کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ہندوستان اور پاکستان کے معاشروں کو

پوری طرح اپنی لپیٹ میں اس طرح لے رکھا تھا کہ دونوں جانب کے سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خاندانوں کے خواب جل کر راکھ ہو گئے اور اَن گنت گھرانے پُشت ہا پُشت سے آباد زمینوں کو چھوڑ کر سرحد کی ایک جانب سے دوسری جانب ہجرت پر مجبور کر دیئے گئے۔

ہندو مسلم فسادات اور ہجرت ہماری قومی سطح کا سب سے بڑا تخلیقی تجربہ ہیں۔ اس لیے وہ لوگ جو اس میں شامل نہیں تھے جنہوں نے ان حالات کو اپنی اپنی جان پر نہیں جھیلا انہوں نے بھی اسی بنیاد پر افسانے لکھے۔ اُردو ادب کا Turning point ہجرت ہے۔ اس سے بڑا کوئی تخلیقی تجربہ پاکستانیوں کو نہیں ملا حالانکہ تقسیم پاکستان کے نتیجے میں بنگلہ دیش کا قیام اس سے بڑا المیہ ہے، لیکن اس کا ذکر ادب میں نسبتاً کم کیا گیا ہے کیونکہ اس موضوع پر شرمندگی کا رنگ غالب رہتا ہے۔ اس لیے بڑے تخلیقی تجربے یعنی فسادات اور ہجرت کا موضوع ہر تخلیق کار پر غالب رہتا ہے۔ زاہدہ حنا اپنی قوم کے اس اجتماعی المیے کا ذکر کرتے ہوئے۔ ہجرت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بناتی ہیں۔

زاہدہ حنا اپنے آبائی وطن سے بہت لگاؤ رکھتی ہیں۔ اگر چہ اُنہوں نے اس گھر کو نہیں دیکھا جس میں پیدا ہوئیں کیونکہ ہجرت کے وقت ان کی عمر تقریباً سوا سال تھی، لیکن آج بھی تصور کی نگاہ سے اس گھر کو دیکھتی اور بے انتہا عشق کرتی ہیں۔ اپنے افسانے 'نا کجا آباد' میں اس اَن دیکھے گھر کی محبت کو یوں بیان کرتی ہیں۔

> ''ان لوگوں کو ہنسنا ہی چاہیے کیونکہ انہیں نہیں معلوم کہ گھر اینٹوں سے بنی ہوئی چاردیواری، چھت اور کمروں کا نام نہیں، گھر تو وہ جگہ ہے جو ہمارے اندر بسی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ایسی جگہ میرا گھر ہو جہاں میں نے آنکھ نہ کھولی ہو، زندگی نہ گزاری ہو بلکہ جسے میں نے دیکھا تک نہ ہو۔ اس سے میرا روح کا رشتہ ہو بالکل ایسے ہی جیسے بہت سے لوگوں کی روح کا رشتہ مقدس مقامات اور مزاروں سے استوار ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں جنہوں نے کبھی ان جگہوں کو دیکھا نہیں ہوتا، ان مزاروں کی خاک اپنے چہروں پر نہیں ملی ہوتی لیکن وہ جگہیں ان کا گھر ہوتی ہیں۔ ایسے گھر جن میں ان کی روح آباد ہو۔'' [۷۹]

تقسیم کے ہی بطن سے ہجرت اور نقل مکانی کے آشوب اُبھرے تھے اور سرحد کے دونوں اطراف مہاجروں اور شرنارتھیوں کے قافلے اپنے آباؤ اجداد اور پُرکھوں کی جنم بھومیوں کو خیر باد کہہ کر نادیدہ جہانوں کی طرف دھکیل دیے گئے تھے۔ زاہدہ حنا کے خاندان کا شمار بھی انہیں میں ہوتا ہے۔ ان خاندانوں کو نئی جگہ آباد ہونے کے دوران بہت زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

زاہدہ حنا کو جنتِ گم گشتہ کی تلاش ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے پر اُکساتی ہے، جہاں وہ گم گشتہ تہذیبی جڑوں کی تلاش کرتی ہیں، لیکن وہ اس ماضی کو تاریخ کی بجائے اجتماعی یاداشت کے حوالے سے جاننے کی کوشش کرتی ہیں جس میں داستان، قصے، کہانیاں اور زبانی روایتوں، مشہور عام خوش گمانیوں اور تصوراتی عناصر کے ذریعے پرکھوں کی اصلیت جاننے کی خواہش مند نظر آتی ہیں۔ وہ ماضی کی خوابناک فضایوں تخلیق کرتی ہیں:

> ''اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ اس جہاز کو دیکھ کر مجھے کتنی بہت سی اور کیسی سریت آمیز یادیں آ رہی تھیں۔ وہ باتیں جنہیں میں نے اپنے بچپن میں سُنا ___ ماضی کی وہ داستانیں جنہیں کسی مقدس امانت کی طرح انہوں نے مجھے منتقل کر دیا تھا اور یہ سلسلہ ہمارے خاندان میں کب سے آ رہا تھا۔'' [۸۰]

زاہدہ حنا کا ننہیال اور ددھیال دونوں سہسرام میں آباد تھے۔ تقسیم کے بعد ددھیال جو مسلم لیگی تھے پاکستان آ کر آباد ہو گئے، لیکن زاہدہ حنا کی ننہیال قوم پرست تھی اس لیے ہندوستان میں ہی رہے۔ آزادی کے بعد سے اب تک وہ وہیں آباد ہیں۔ زاہدہ حنا کی والدہ کے لیے ہجرت کا کرب صرف اپنی زمین سے جدائی ہی نہیں بلکہ اپنے خاندان سے جُدا ہونے کا نام بھی تھا۔ زاہدہ حنا چونکہ بڑی بیٹی تھیں اس لیے انہوں نے چھوٹی عمر سے ہی اپنا ہم راز بنا لیا اور اپنی تکالیف اور ہجر کی داستانیں زاہدہ حنا کو سناتی رہیں۔ اس لیے زاہدہ حنا کو اس زمین سے، گلیوں سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اپنے انٹرویو میں کہتی ہیں:

> ''میری والدہ مجھے اُن گلیوں کی، لوگوں کی، رہن سہن کی داستانیں سُناتی تھیں۔ اس لیے وہ جگہیں میری روح میں بستی ہیں۔ میں نے ان جگہوں کو اپنی والدہ کی نگاہ سے دیکھا ہوا ہے۔ ان جگہوں کی شناخت میں فوراً کر

لوں گی۔'' [۸۱]

انسان کی اپنے آبائی وطن سے محبت تہذیبی مسئلہ ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے آبائی ملک سے جہاں ان کی جڑیں تھیں ہجرت کی۔ اُن کے لیے اس دُکھ کو سمجھنا آسان ہے، لیکن ہجرت کے اس کرب کو سمجھنا ان لوگوں کے بس میں نہیں ہے جنھوں نے اس اذیت کو اپنی جان پر نہیں سہا۔

۱۹۴۷ء میں یکدم ہی ملک کے درمیان دیوار کھنچ گئی۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہوگئے۔ زاہدہ حنا نے اپنی والدہ کے اپنوں سے جُدائی کے تجربے کی نبیاد پر افسانہ ''ہوا پھر سے حُکم صادر'' تحریر کیا کہ کس طرح سرحد کے دونوں اطراف کے لوگ ایک دوسرے کے لیے تڑپتے رہے، لیکن قومی شناخت، پاسپورٹ، نیشنلٹی جیسے مسائل ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے وہ نادرہ، جس کے لاڈ اٹھاتے ابا میاں نہ تھکتے تھے جنھوں نے اسے ماں کی کمی کبھی محسوس نہ ہونے دی تھی، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ انڈیا آخری دیدار کے لیے جاسکے کیونکہ ہزار سال تک اکٹھے رہنے والے لوگ اب ایک دوسرے کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ پوری دُنیا سے سفر کر کے ان دو نئے ممالک میں پہنچا جاسکتا تھا لیکن انڈیا پاکستان میں آمدورفت پر پابندی تھی۔ اس لیے نادرہ کی بہن امریکہ سے تو انڈیا جاسکتی تھی لیکن نادرہ اَبا میاں کے آخری دیدار کے لیے نہ پہنچ سکی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''وہ اس سے یہ کس طرح کہتی کہ میری جان! تم میرا خون ہو اور تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میری اور تمہاری شہریتیں الگ ہیں۔ ہم دونوں کا خمیر ایک مٹی سے اُٹھا ہے، لیکن ہم دو کروں پر زندہ ہیں۔ تم بابا جان کے پاس چھ ہزار میل کا سفر کر کے دو دن میں پہنچ جاؤ گی اور میں چند سو میل کی دوری پر ہونے کے باوجود جانے کب پہنچوں۔ میرے راستے میں میرے اپنے فیصلے کی اور جنگ کی چھل پائی بیٹھی ہے۔ میرے لیے میرا آبائی شہر مریخ سے بھی پرے ہے۔ کہکشاؤں سے بھی دُور ہے۔'' [۸۲]

زاہدہ حنا کے نزدیک تقسیم کا عمل انتشار، فسادات، قتل و غارت، اقدار کی شکست و ریخت اپنے ہمراہ لایا ہے۔ ایک قدیم ہند اسلامی تہذیب کا خاتمہ زاہدہ حنا کے کرداروں کے کرب، تنہائی اور دُکھ کا باعث ہے۔ زاہدہ حنا کے تمام کردار تعلیم یافتہ اور بدلتی دُنیا کے منظرنامے پر

تلملاتے، کُڑھتے اور اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں اور یہ کردار خود زاہدہ حنا کی ذات کا عکس ہیں۔ وہ ہجرت کے خلاف شدید ردِعمل اور اپنی بے بسی، کچھ نہ کر سکنے کا احساس کرداروں کے ذریعے اپنی تخلیقات میں پیش کرتی ہیں۔ اپنے افسانے ''زیتون کی ایک شاخ'' میں لکھتی ہیں:

''تم یہودی ہو اور تم نے سینکڑوں برس ہجرت کا عذاب سہا ہے، لیکن کیسی دلچسپ بات ہے کہ تم ان فلسطینیوں کا دُکھ نہیں سمجھتے جنہیں اپنے گھروں سے نکلنا پڑا اور تم ہمارے عذاب بھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم کہ پہلے برٹش انڈیا کی قومیت رکھتے تھے۔ اب پاکستان میں مہاجرین۔ ہم بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں ہیں تمہیں یرمیاہ جیسا نوحہ گر ملا تھا لیکن ہمیں تو کوئی یرمیاہ بھی نصیب نہیں آیا۔'' [۸۳]

ہجرت کر کے آنے والوں کے ہاتھ سوائے حیرت، حسرت اور ناکامی کے اور کچھ نہ آیا۔ ہجرت کرتے ہوئے لوگ جو خواب، اُمیدیں، اُمنگیں لے کر اپنے آبائی وطن کو ترک کر کے خالی ہاتھ چلے تھے۔ ان کے خواب نئی سرزمین پر بُری طرح سے ٹوٹے کیونکہ نئے ملک میں نہ ان کی زمین اپنی تھی اور نہ سر پر آسمان۔ یہاں اُن کی شناخت 'مہاجر' کے طور پر کی گئی اور آج بھی جبکہ ان کی کئی نسلیں یہاں آباد ہیں۔ یہ مہاجر ہی کہلائے جاتے ہیں۔ ان تہی دستوں کے کرب کو زاہدہ حنا نے معدوم ابن معدوم، بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود، ہوا پھر سے حکم صادر، منزل ہے کہاں تیری، زمین آگ کی، آسمان آگ کا، آخری بوند کی خوشبو میں بیان کیا ہے۔

زاہدہ حنا باشعور سوچنے، غور کرنے والی خاتون ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء میں ہونے والی تقسیم کے سخت خلاف ہیں۔ ادیب انسانیت سے پیار کرنے والا ہوتا ہے اور اس موقع پر انسانیت جس طرح نوحہ کناں تھی ہر امن پسند انسان نے اس حوالے سے تقسیم کو ناپسند کیا، لیکن زاہدہ حنا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ لوگ جو ایک ہزار سال سے اکٹھے رہ رہے تھے۔ ان کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل کا حل یہ نہیں تھا کہ ان کو علیحدہ علیحدہ ممالک دے دیئے جائیں۔ آج جبکہ پاکستان میں انتشار عروج پر ہے تو اس کا بھی یہی حل مناسب ہوگا؟ ہرگز نہیں۔ اس حوالے سے انٹرویو میں کہتی ہیں:

''کسی بھی مسئلے کا کوئی دائمی حل نہیں ہوتا۔ ہم نے متحدہ ہندوستان کے

مسلمانوں کے مسائل کا 'دائمی حل' پاکستان کی صورت میں ڈھونڈا تھا لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ مشرقی پاکستان 'بنگلہ دیش' بن کر ہم سے الگ ہو گیا۔ باقی ماندہ قومیتیں آج ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں اور ان کے درمیان دوری کم ہونے کی بجائے مسلسل بڑھ رہی ہے۔ دُنیا کے تمام مسائل کا حل مذاکرات اور بات چیت کے ذریعے ہو سکتا ہے تو مذاکرات تباہی کے بعد کیوں؟ تباہی سے قبل کیوں نہیں؟'' [۸۴]

تقسیم ہند، فسادات، قیامِ پاکستان، ہجرت جیسے مسائل کو ہر تخلیق کار نے بیان کیا ہے، لیکن زاہدہ حنا نے اسے اپنے اندر جذب کیا ہے سرحدوں کی تقسیم نے کس طرح انسانوں اور رشتوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اُنہیں اپنی والدہ کے حوالے سے اس بات کو زیادہ قریب سے دیکھنے، محسوس کرنے کا موقع ملا۔ زاہدہ حنا نے ہجرت تقسیم کے بعد ہونے والے فسادات، لوٹ مار، انسانوں کے قتل عام کو موضوع نہیں بنایا بلکہ ہجرت کے بعد انسانی رشتوں اور اقدار و روایات میں آنے والی تبدیلی اور اس تبدیلی کے معاشرے پر اثرات کو بغور دیکھا اور اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

زاہدہ حنا نے اپنے افسانے 'معدوم ابنِ معدوم' میں تین نسلوں کی تباہی اور لا حاصلی کے ذریعے ہجرت کی ناکامی کو انتہائی فنکارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ کرنل معصوم حسین کے خاندان کے ذریعے ہجرت کو وقت کے تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ کرنل معصوم حسین کا بیٹا جعفر حسین جو کراچی جا کر اپنی پھوپھی زاد سے شادی کر کے بہترین معاشی امکانات کو دیکھ کر وہیں رہائش اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا بیٹا علی اکبر کراچی میں پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ یوں ہجرت کے کارن تین نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں کیونکہ ان کی نسل کو آگے بڑھانے والا ہی ختم ہو گیا۔ ان تین نسلوں کی ہجرت سے ہونے والی بربادی پر زاہدہ حنا کا یہ نقطۂ نظر سامنے آتا ہے کہ

''ارے میاں، مجھے کیا سُناتے ہو؟ ہم کم نصیب تو اسی شعر کی چلتی پھرتی تصویر ہیں، لیکن سوچو تو سہی، یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ گھر میں آگ لگے تو اسے بجھانے کی بجائے آدمی اپنے سارے رشتوں کو آگ میں گھرا چھوڑ

کر بھاگ نکلے یہ سوچے بھی نہیں کہ رہ جانے والے راکھ ہو جائیں گے۔''[۸۵]

تقسیمِ ہند نے لوگوں کے درمیان دوری کی ایک دیوار کھڑی کر دی جو صرف زمینی ہی نہیں بلکہ جذباتی بھی تھی۔ وہ لوگ جو ہجرت کر کے پاکستان گئے اپنی نئی دنیا بسائی۔ انہوں نے پلٹ کر کبھی بھی پیچھے رہ جانے والوں کو نہیں دیکھا۔ یہ کبھی نہیں سوچا کہ ان لوگوں کا جدائی میں کیا حال ہوگا۔ وہ اپنے پیاروں کے لیے کس طرح تڑپ رہے ہوں گے۔ 'منزل ہے کہاں تیری' میں زاہدہ حنا نے اس تلخ حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

''وہ برسوں سے بڑے بیٹے کے گھر میں تھیں۔ دو بیٹے جو پاکستان میں تھے انہوں نے کبھی پلٹ کر خبر ہی نہ لی تھی۔ کچھ دنوں انہوں نے ان دونوں کا غم منایا پھر یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ ترکِ وطن کرنے والے اپنے خون سے رشتوں کی خوشبو نچوڑ کر اپنے پیچھے ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ ساتھ لے جائیں تو یادوں اور یادگاروں سے کلیجہ شق نہ ہو جائے۔''[۸۶]

ماں جیسے رشتے کو تقسیم اور ہجرت نے غیر اہم بنا دیا تو پھر اس ہجرت سے ناکامی ہی حاصل ہوئی۔ معدوم ابنِ معدوم، منزل ہے کہاں تیری، نا کجا آباد، زمین آگ کی، آسمان آگ کا، آخری بوند کی خوشبو، یہ ہر سو رقصِ بسمل بود میں ہجرت کی ناکامی کا احساس ملتا ہے۔

ہجرت کے بعد ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی جن کو زمینی ہجرت سے بہت فائدہ ہوا وہ خودغرضی کا لبادہ اوڑھ کر معاشرے کی جڑوں میں یہ خودغرضی اُتار رہے ہیں۔ مزید پیسے اور ترقی کی ہوس میں دیگر ممالک کا رُخ کر رہے ہیں۔ خصوصاً یورپی ممالک جن سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہم نے بہت تکالیف سہیں۔ اب انہیں کے غلام بننے کے لیے لوگ اُنہیں کے ملک جا کر بسنے کے متمنی ہیں کیونکہ یورپ نے ہمیں ذہنی طور پر اپنا غلام بنا لیا ہے۔ غلامی کی یہ شکل زاہدہ حنا کے لیے تکلیف دہ ہے۔ وہ 'معدوم ابنِ معدوم' افسانے میں جعفر کے کردار کی زبانی اپنے خیالات یوں بیان کرتی ہیں:

''وہاں میرا مکان ہے دادی بیگم۔ وہاں ہماری ہوا اُکھڑ چکی۔ یہاں سے جانے والوں کی بڑی بڑی جائیدادیں اپنی بنیادیں چھوڑ چکیں۔ تب ہی تو

سب کے بچے باہر پڑھ رہے ہیں تب ہی تو سب گرین کارڈ کے خواب دیکھتے ہیں۔ یہاں سے جانے والے اپنا مقدمہ ہار چکے ہیں دادی بیگم ___ دادا میاں! آپ چھ سو برس سے اس زمین پر ہیں تو آپ برگد کی طرح ہوئے جو زمین سے جتنا اوپر نظر آتا ہے اس سے کہیں زیادہ گہرائی میں اور کہیں زیادہ دُور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کو اور دادی بیگم کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ یہاں گڑے ہوئے ہیں اور ہم؟ ہم سبز شیشے میں سانس لیتے ہوئے منی پلانٹ کی طرح ہیں ___ جس کا زمین سے کوئی ناطہ، کوئی رشتہ نہیں۔'' [۸۷]

زاہدہ حنا کا ہجرت کے بارے میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب کوئی اپنے آبائی وطن سے نفرت کی بنیادوں پر نیا وطن اختیار کرتا ہے تو اختیاری وطن سے کسی قسم کی جذباتی وابستگی ایک طویل عرصے تک ہونا ممکن ہی نہیں۔ جب کسی کو اپنے وطن سے محبت ہوگی تو وہ دوسروں کے ممالک سے بھی اُنسیت محسوس کرے گا۔ دوسروں کے وطن اسے اچھے لگیں گے اور نئی جگہ پر اس کی پیوند کاری آسان ہوگی، لیکن جب حالات کے جبر کے تحت یا بہتر مستقبل کے لیے ہجرت کی جائے تو پھر زمین سے محبت کا رنگ کہیں دَب جاتا ہے۔ صرف ذاتی مفاد کا جذبہ حاوی ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمارے ملک میں پیسے کی ہوس، گرین کارڈ کا لالچ، دہشت گردی جیسے مسائل عروج پر ہیں۔

زاہدہ حنا ہجرت کرنے والے اور اپنی زمینوں سے جڑ کر ہجرت نہ کرنے والوں کے جذباتی و روحانی اور جسمانی کرب کو نہایت خوبصورت انداز میں افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہجرت اور جلاوطنی ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ جلاوطن ہونے والے تمام عمر اپنے ملک کو یاد کرتے اور واپس آنے کے لیے تڑپتے رہتے ہیں مثلاً بہادر شاہ ظفر کا حوالہ بار بار دیتی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی ہڈیوں کو بھی چاہنے کے باوجود ہندوستان منتقل نہیں کیا جا سکا کہ وہ تقدیر کے زنداں میں قید لوگوں میں سے ہیں جہاں سے رہائی ممکن نہیں اور جو خود اپنی مرضی سے زمین کو ترک کرتے ہیں۔ وہ اُسے پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ اپنی زمین کے متعلق انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوں کو زاہدہ حنا کمال مہارت سے اپنی تحریروں میں بیان کرتی نظر آتی ہیں۔

زاہدہ حنا کے ہاں ہجرت کے خلاف ناپسندیدگی کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ صرف ۱۹۴۷ء ہی کی نہیں بلکہ تاریخ کی ہر ہجرت ہے۔ چاہے وہ زرتشت مذہب کے حامیوں کی ہو یا پاکستان ہندوستان کی یا عورت کی شادی کے بعد کی ہجرت یہ احساس حاوی ہے کہ ہجرت کا مطلب ہے خالی ہاتھ ہو جانا جو کوئی پسند نہیں کرتا۔

زاہدہ حنا تاریخ کے حوالے سے اس بات پر زور دیتی ہیں کہ ہجرت کرنے والوں پر زندگی کبھی مہربان نہیں ہوتی۔ 'یکے بود، یکے نہ بود' میں اس حقیقت کو یوں بیان کرتی ہیں:

''اس روز اتنے عرصے بعد مجھے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ بہائی ہے اس کا دُکھ سمجھ میں آتا تھا۔ ایران میں شہنشاہت ختم ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی بہائیوں پر ایران کی سرزمین ایک بار پھر تنگ ہو چکی تھی۔ ہجرت کی پُرانی کہانیاں نئی سرزمینوں میں دُہرائی جا رہی تھیں اور متعدد بہائی خاندان پاکستان میں پناہ لیے ہوئے تھے۔'' [۸۸]

زاہدہ حنا ایک حساس اور باشعور تخلیق کار کی طرح ہجرت کے نتیجے میں گم شدہ جذبوں، جبلتوں، رشتوں، آدرشوں اور روایات کو تاریخ کے جبر کی روشنی میں پرکھتی ہیں اور ہجرت کے تجربے کے پس منظر میں اس بات کا تعین کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ اس اجتماعی ابتلا نے 'فرد' کو کس حد تک بدلا۔ اس المیے کی تہہ میں اُتر کر انسان کے بربریت آشنا رویے کو موضوع بنایا اور اس کے توسط سے انسان کے اندر چھپی وحشت اور ایذا رسانی کی سرشت کو بے نقاب کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زاہدہ حنا: ''جسم وزباں کی موت سے پہلے''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۲۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۸۔

۳۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر: ''روایتی اور جدید افسانے کی تکنیک کا فرق''، مشمولہ ''مکالمہ''، کراچی، جولائی ۲۰۰۶ء-دسمبر ۲۰۰۷ء، اکادمی بازیافت، ص ۴۶۸۔

۴۔ زاہدہ حنا: ''پانیوں پر بہتی پناہ''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۳۴۔

۵۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۷۳۔

☆ ساکائے سوبوئی جاپانی ناول نگار ہیں "24 Eyes" ناول ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ اجمل کمال نے اس کا اُردو ترجمہ ''چوبیس آنکھیں'' کے نام سے ۱۹۹۵ء میں کیا اور اسے مشعل لاہور نے شائع کیا۔

۶۔ ساکائے سوبوئی: ''چوبیس آنکھیں''، مترجم: اجمل کمال، ص ۵۔

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''امن اور جنگ''، مشمولہ ''سوال یہ ہے'' مرتب: نوشی انجم، ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳۷۔

۸۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۸۱۔

۹۔ علی احمد فاطمی: ''رقصِ بسمل ہے-زاہدہ حنا کی نئی کہانیاں''، مشمولہ ''اسالیب''، کراچی، اسالیب پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۱۱ء-دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۳۲۶۔

۱۰ زاہدہ حنا: ''کم کم بہت آرام سے ہے''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۵۸۔

۱۱۔ زاہدہ حنا: ''زیتون کی ایک شاخ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۳۱۔

۱۲۔ زاہدہ حنا: ''تتلیاں ڈھونڈ نے والی''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈ نے والی''، ص ۲۱۷۔

۱۳۔ اَرُن دھتی، رائے: ''سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت'' (مترجم) احمد ندیم، سوجھلا برائے سماجی تبدیلی، ملتان، ۲۰۱۲ء، ص ۸۱۔

۱۴۔ زاہدہ حنا: ''ہوا پھر سے حکم صادر''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۲۵۰۔

۱۵۔ زاہدہ حنا: ''بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۰۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔

۱۷۔ اَرُن دھتی، رائے: ''سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت''، ص ۱۳۲-۱۳۳۔

۱۸۔ میلان کنڈیرا: ''ناول کا فن'' (مترجم) محمد عمر میمن، کراچی، شہرزاد پبلشرز، ۲۰۱۳ء، ص ۴۴۔

۱۹۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''زاہدہ حنا، عصرِ حاضر کی باشعور کہانی کار''، مشمولہ ''اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۵۲۹۔

۲۰۔ زاہدہ حنا: ''جنگ، جرنیل اور فلسفی''، مشمولہ ''اُمیدِ سحر کی بات سُنو''، کراچی، پاکستان اسٹڈی سنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۱۔

۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر: ''تاریخ شناسی''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۴۔

۲۲۔ زاہدہ حنا: ''تاریخ، کیا واقعی دفن کی جا سکتی ہے؟''، مشمولہ ''اُمیدِ سحر کی بات سُنو''، ص ۱۳۹۔

۲۳۔ زاہدہ حنا: ''زیتون کی ایک شاخ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۳۶۔

۲۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۱۵۶۔

۲۵۔ میلان کندیرا: ''ناول کا فن'' (مترجم) محم عمر میمن، ص ۵۳، ۵۴۔

۲۶۔ زاہدہ حنا: ''بہ ہر سُو رقصِ بسمل بود''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۰۸۔

۲۷۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۷۵۔

۲۸۔ علی احمد فاطمی: ''رقصِ بسمل ہے- زاہدہ حنا کی نئی کہانیاں''، مشمولہ ''اسالیب''، ص ۳۱۳۔

۲۹۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۸۳۔

۳۰۔ زاہدہ حنا: ''پانیوں میں سراب''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۸۳۔
۳۱۔ رضیہ فصیح احمد: فلیپ ''قیدی سانس لیتا ہے''۔
۳۲۔ زاہدہ حنا: ''صرصر بے اماں کے ساتھ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۳۵،۳۶۔
۳۳۔ فاطمہ حسن: ''کتابِ دوستاں''، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص۸۱۔
۳۴۔ مقبول بیگ بدخشانی، پروفیسر: ''تاریخِ ایران''، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۷ء، ص۵۷۴۔
۳۵۔ زاہدہ حنا: ''صرصر بے اماں کے ساتھ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۵۱۔
۳۶۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۱۸۳۔
۳۷۔ خاور نوازش، محمد: ''ادب، زندگی اور سیاست''، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۲ء ص۱۵۔
۳۸۔ زاہدہ حنا: ''منزل ہے کہاں تیری''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۱۷۔
۳۹۔ مبین مرزا: ''اکیسویں صدی میں جدید اُردو افسانے کے تخلیقی نقوش''، مشمولہ ''اسالیب''، کراچی، اسالیب پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۱۱ء۔دسمبر ۲۰۱۲ء، ص۴۷۷۔
۴۰۔ زاہدہ حنا: ''بہ ہر سو رقصِ بسمل بود''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۱۱۱،۱۱۲۔
۴۱۔ ایضاً، ص۱۱۸۔
۴۲۔ اُرن دھتی رائے: ''جمہوریت''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ ''ادبیات''، خواتین کا عالمی نمبر، پاکستان، اکادمی ادبیات، جلد۱۴، ۱۵، شمارہ ۵۹، ۶۰، ۲۰۰۲ء، ص۴۷۔
۴۳۔ زاہدہ حنا: ''معدوم ابنِ معدوم''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۴۴۔
۴۴۔ زاہدہ حنا: ''زیتون کی ایک شاخ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۲۶۔
۴۵۔ زاہدہ حنا: ''تقدیر کے زندانی''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۲۱۹۔
۴۶۔ زاہدہ حنا: ''آخری بوند کی خوشبو''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۲۸۲۔
۴۷۔ زاہدہ حنا: ''رنگ تمام خوں شد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۱۶۳۔
۴۸۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ اور عورت''، ۲۰۰۱ء، ملتان، بہاء الدین زکریا

یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۵۔

۴۹۔ خالدہ حسین: ''ابتدایئے کے تین رُخ''، مشمولہ ''ادبیات'' (خواتین کا عالمی ادب نمبر)، ص ۱۴۔

۵۰۔ زاہدہ حنا: ''آنکھوں کے دیدبان''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۷۔

۵۱۔ زاہدہ حنا: ''ساتویں رات''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۱۴-۱۱۵۔

۵۲۔ حامد بیگ، مرزا: ''افسانے کا منظر نامہ''، لاہور، اوریئنٹ پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۱۴۔

۵۳۔ عارفہ سیدہ، ڈاکٹر: ''خواتین کے بارے میں تعلیمی مغالطے''، مشمولہ ''عورت، زبانِ خلق سے زبانِ حال تک'' (مرتبہ) کشور ناہید، ۲۰۱۰ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۲۶۳۔

۵۴۔ زاہدہ حنا: ''آنکھوں کے دیدبان''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۷۵-۷۶۔

۵۵۔ زاہدہ حنا: ''عورت زندگی کا زنداں''، ص ۷۵-۷۶۔

۵۶۔ مظہر عباس: ''عورت تحفظ کی تلاش میں''، مشمولہ روزنامہ ''نوائے وقت''، ۱۸ جولائی ۲۰۰۹ء۔

۵۷۔ زاہدہ حنا: ''زمیں آگ کی آسماں آگ کا''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۷۵۔

۵۸۔ فاطمہ حسن، ڈاکٹر: ''کتابِ دوستاں''، ص ۷۸-۷۹۔

۵۹۔ زاہدہ حنا: ''جل ہے سارا جال''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص

۶۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''عصرِ حاضر کی باشعور کہانی کار''، مشمولہ ''اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، ص ۵۲۹۔

۶۱۔ زاہدہ حنا: ''نیند کا زرد لباس''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۲۰۶۔

۶۲۔ مبارک علی، ڈاکٹر: ''عورت اور تاریخ''، مشمولہ ''عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک''، ص ۹۱۔

۶۳۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۷۹۔

۶۴۔ زاہدہ حنا: ''بہ ہر سو رقصِ بسمل بود''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۰۵۔

۶۵۔ زاہدہ حنا: ''ناکجا آباد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۱۱۔

۶۶۔ حمیرا اشفاق: ''جدید اُردو فکشن (عصری تقاضے اور بدلتے رُجحانات)''، لاہور، سانجھ، ص۱۴۸۔

۶۷۔ وارث میر، پروفیسر: ''کیا عورت آدھی ہے''، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص۶۶۔

۶۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''تنقیدی تھیوری کے سو سال''، لاہور، سانجھ، ۲۰۱۰ء، ص۱۶۱۔

۶۹۔ زاہدہ حنا: ''شیریں چشموں کی تلاش''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی، ص۹۱۔

۷۰۔ ایضاً، ص۹۴۔

۷۱۔ زاہدہ حنا: ''ناکجا آباد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی، ص۱۷۔

۷۲۔ ایضاً، ص۱۸۔

۷۳۔ زاہدہ حنا: ''ساتویں رات''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی، ص۱۱۱۔

۷۴۔ زاہدہ حنا: ''آنکھوں کے دیدبان''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی، ص۳۷۔

۷۵۔ زاہدہ حنا: ''منزل ہے کہاں تیری''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۳۷۔

۷۶۔ مظہر جمیل: ''زاہدہ حنا کے افسانے - ایک مطالعہ''، مشمولہ ''طلوع افکار''، کراچی، دسمبر، جنوری، ۱۹۹۵ء، ص۲۴۔

۷۷۔ زاہدہ حنا ''تتلیاں ڈھونڈنے والی، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی، ص۲۲۲۔

۷۸۔ ناہید قمر، ڈاکٹر: ''اُردو فکشن میں وقت کا تصور''، پاکستان، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۲۲۰۔

۷۹۔ زاہدہ حنا: ''ناکجا آباد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۱۱۔

۸۰۔ زاہدہ حنا: ''صرصرِ بے اماں کے ساتھ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۷۴۔

۸۱۔ راقمہ سے ٹیلی فونک گفتگو، بتاریخ ۱۶ ستمبر ۲۰۱۴ء، بہ وقت ۴:۱۵۔

۸۲۔ زاہدہ حنا: ''ہوا پھر سے حکم صادر''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص۲۴۳۔

۸۳۔ زاہدہ حنا: ''زیتون کی ایک شاخ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص۳۷۔

۸۴۔ راقمہ سے ٹیلی فونک گفتگو۔

۸۵۔ زاہدہ حنا: ''معدوم ابنِ معدوم''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۴۵۔
۸۶۔ زاہدہ حنا: ''زمین آگ کی، آسمان آگ کا''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۸۳۔
۸۷۔ زاہدہ حنا: ''معدوم ابنِ معدوم''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۴۵۔
۸۸۔ زاہدہ حنا: ''یکے بود یکے نہ بود''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۲۰۸۔

باب سوم:

زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری
(فنی جائزہ)

۱۔ زاہدہ حنا کا اُسلوب

۲۔ زاہدہ حنا کی کردار نگاری

۳۔ متنوع تکنیکوں کا استعمال

زاہدہ حنا کا اُسلوب

ادب کی کسی بھی صنف کا جائزہ لینا ہو یا انفرادی سطح پر کسی تخلیق کار کی تحریروں کا فنی جائزہ لینا ہو تو عموماً اصلاحی، رومانوی یا ترقی پسند رویہ دکھائی دیتا ہے اور تخلیق کار کبھی سادہ کبھی بیانیہ، کبھی رنگینی بیان سے کام لیتا ہے۔ تخلیقی ادب میں اُسلوب کے متنوع رنگ وروپ دکھائی دیتے ہیں اور افسانے کی دنیا میں تو ہمیں تکنیک واُسلوب کے ایسے ایسے رنگ دکھائی دیتے ہیں جو اپنے اندر ایک دبستان لیے ہوئے ہیں۔ ابتدا میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری عموماً تین مختلف جہتوں اور تکنیک کی نمائندگی کرتے رہے اس کے بعد بہت سے نام آتے ہیں۔ ان میں منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، رشید جہاں، نیاز فتح پوری، ابوالکلام آزاد، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، خالدہ حسین، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، رشید امجد، اسد محمد خان، منشا یاد اور اس کے بعد بے شمار نام گنوائے جاسکتے ہیں جو افسانے کے متنوع رنگ، اُسلوب اور نقطہ نظر کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

اُسلوب کو انکشافِ ذات اور اظہارِ ذات کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا اُسلوب ذات اور شخصیت کا اظہار ہے۔ اُردو میں اُسلوب انگریزی لفظ 'Style' کے مترادف کے طور پر مستعمل ہے۔ اس سے مراد 'اظہار، لکھنے کا طریقہ، طرزِ بیاں، اندازِ نگارش' [۱] مراد لیا جاتا ہے۔

سید عابد علی عابد اُسلوب کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اُسلوب سے مُراد کسی لکھنے والے کا وہ انفرادی طرزِ نگارش ہے جس کی بناء پر دوسرے لکھنے والوں سے ممیّز ہو جاتا ہے۔'' [۲]

یعنی اُسلوب تحریر کے مخصوص انداز کا نام ہے۔ اُسلوب کو مصنف کی شخصیت کی پہچان کہا جاتا ہے کیونکہ مصنف کی شخصیت واضح طور پر تحریر میں جھلکتی ہے۔ ہر شخص دنیا کو ایک مختلف

زاویہ نظر سے دیکھتا، اس کے بارے میں سوچتا اور مخصوص اندازِ بیاں سے اس کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ اس لیے اُسلوب کو شخصیت کا عکس کہا جاتا ہے۔

اُسلوب کی تشکیل میں صرف مصنف کے تجربات و مشاہدات یا نظریات ہی اہم نہیں ہوتے بلکہ اس دور کا سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی ماحول بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

زاہدہ حنا اُردو ادب میں ایک منفرد اُسلوب کی حامل افسانہ نگار ہیں۔ اُن کے تجربات، مشاہدات اور مطالعہ اُسلوب سے عیاں ہے۔ مطالعے کو اسی شدت سے قارئین تک منتقل کرنا چاہتی ہیں جتنا اثر خود ان کی ذات پر ہوا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔ تخلیق کار کے اُسلوب میں مطالعے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس اہمیت کو ''نوجوان ناول نگار کے نام خط'' میں ماریو برگس یوسا نے یوں بیان کیا ہے کہ

> ''چوں کہ تم ایک ناول نگار بننا چاہتے ہو اور ایک مربوط اور ناگزیر اُسلوب کے بغیر نہیں بن سکتے ہو، اپنے لیے ایک اُسلوب کی تلاش میں نکل کھڑے ہو، مسلسل پڑھا کرو کیوں کہ وافر مقدار میں اچھا ادب پڑھے بغیر زبان کا پُر مایہ اور بھرپور احساس پیدا کرنا ناممکن ہے۔'' [۳]

اور یہی محنت زاہدہ حنا کے اُسلوب میں نظر آتی ہے۔

زاہدہ حنا کے ہاں تاریخ کا رجحان بہت زیادہ ہے اور یہ رجحان کسی بھی تخلیق کار کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں کیونکہ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے اس کی تہذیب، ثقافت، فلسفہ، تصوف، سیاسی نظریات اور آج تک ہونے والی تبدیلیوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ زاہدہ حنا تاریخ کے اس وسیع کینوس سے کامیابی سے نپٹنے کے لیے شعور کی رو کا استعمال کرتی ہیں۔ اس تکنیک سے وابستہ دو تکنیکوں فلیش بیک اور خود کلامی سے انہوں نے استفادہ کرتے ہوئے تاریخ کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ہیئت، مواد اور موضوع کے ساتھ ایک نہیں کئی صدیاں اور نسلیں ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرتی محسوس ہوتی ہیں۔

زاہدہ حنا نے اپنے افسانے ''جاگے ہیں خواب میں'' میں تاریخ کے تناظر میں حال کی تباہی و بربادی کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''وقت کی غلام گردشوں میں شہر غلام، آبادیاں باندیاں، بخت نصر سے

بُش جونیئر تک ایک ہی کہانی جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے۔ کوتوالی چبوترے کے سامنے بچھی ہوئی کُرسیاں، کُرسیوں پر کمپنی بہادر کے افسر ڈٹے ہوئے، اپنے اپنے چُرٹ سلگائے ہوئے، شہر والوں کا رقصِ بسمل دیکھتے ہوئے، جمنا کی آنکھیں اپنے کناروں سے چھلکتی ہوئی، دجلہ کی سُرخ لہروں نے اُٹھ اُٹھ کر اپنے شہریوں کو دیکھا۔ محقق طوسی کا قلم کاغذ پر چل رہا تھا اور وہ امیر المومنین کے حرم کی سات عورتوں کی لشکرِ ہلاکو میں تقسیم کو بے اعتنائی سے لکھ رہا تھا۔ شیراز کے سعدی کا سر خاک سے بھرا ہوا تھا۔ نازنینانِ حرم کی بے حُرمتی کا ماتم کرتے ہوئے اس کی آواز لہو رو رہی تھی۔'' [۴]

شخصیت اور اُسلوب ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ شخصیت کا خاصا ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ مائل بہ ارتقاء رہتی ہے اور اسلوب بھی وقت کے ساتھ ساتھ ارتقائی منازل طے کرتا رہتا ہے اور یوں وقت گزرنے کے ساتھ شخصیت اور اُسلوب نکھرتے جاتے ہیں۔ زاہدہ حنا کے اُسلوب میں بھی ارتقاء نظر آتا ہے۔ اس کے پہلے افسانوی مجموعے ''قیدی سانس لیتا ہے'' میں رومانوی قنوطیت پائی جاتی ہے۔ ایک بھرپور ماضی کی یادیں اس مجموعے میں ملتی ہیں۔ زاہدہ حنا کو اپنا ماضی بہت عزیز ہے ان کا خمیر اپنے پُرکھوں کی مٹی سے گندھا ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ماضی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کیونکہ پیدائش کے فوراً بعد پاکستان والدین کے ساتھ منتقل ہو گئیں، لیکن تخیل کی آنکھ سے زاہدہ حنا اس ماضی کو دیکھتی اور کرداروں کے ذریعے اس کو پیش کرتی ہیں۔ اس حوالے سے انتظار حسین لکھتے ہیں:

''جب میں زاہدہ کی ذاتی زندگی کو اس کی کہانیوں سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو میں ناکام ہو جاتا ہوں۔ میری ناکامی ہی میری کامیابی ہے۔ زاہدہ کے ہاں آرٹ اور شخص کی یہ حیثیت 'وحدت الوجود' قیدی کے سانس لینے سے اس کی سانس اُکھڑ جانے تک ہے اور اُکھڑی سانسوں کے ساتھ اپنی اُنگلیاں اور دل لہو میں ڈبونے کی جدوجہد تک ہے۔'' [۵]

زاہدہ حنا ماضی کو بہت دلنشیں پیرائے میں 'نا کجا آباد' میں یوں بیان کرتی ہیں:

''بھادوں کا مہینہ ہے بی بی حضرت خواجہ خضر کا روزہ کھول کر بڑی بڑی روٹیوں پر بھورا کتھا اور پان رکھ کر اور نیاز دے کر باہر پلنگڑی پر آ بیٹھیں گی۔ ڈلی کتریں گی اور نئے پانوں کی ڈھولی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھیں گی ان کی آبِ رواں کی ساڑی میں لگی ہوئی ابرق جھلملائے گی بالیوں میں گندھے ہوئے بیلے کے پھول سر کی جنبش کے ساتھ جھولتے رہیں گے اور وہ بیڑا لگاتے ہوئے ہلکے سروں میں گنگنائیں گی۔ الاہ تیری گلیوں میں برسے نور، بیلا بھی بویا چنبیلی بھی بوئی، الاہ میں نے بوئے ہزاروں پھول، بیلا بھی پہنا، چنبیلی بھی پہنی، الاہ تیری گلیوں میں برسے نور۔'' [٦]

زاہدہ حنا اپنے ماضی کی اسیر ہیں۔ اس ماضی کو بیان کرتے ہوئے اسی عہد کی حقیقی تصاویر اور زبان و بیان کو استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی زبان کرداروں اور ماحول سے مطابقت رکھتی ہے اور ذہن پر انتہائی خوبصورت تاثر مرتب کرتی ہے۔

زاہدہ حنا کے دوسرے افسانوی مجموعے ''راہ میں اجل ہے'' میں رومانیت کی جگہ تلخ حقائق نے لے لی ہے اور اُن کے موضوعات کے ساتھ ساتھ اُسلوب میں بھی حقیقت پسندانہ رویہ نظر آتا ہے۔ تیسرے اور آخری مجموعے ''رقصِ بسمل ہے'' میں ایسے واقعات اور موضوعات ہیں جو قاری کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ اس میں زاہدہ حنا کا خاص موضوع جنگ اور اس کی تباہ کاریاں اور انسانی زندگیوں پر اس کے اثرات ہیں۔ وہ قاری کو اپنی رائے سے اختلاف یا اتفاق کی دعوت کی بجائے دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ وہ اپنی معلومات اور مطالعے سے اخذ کردہ نتائج کو قاری کے سامنے پیش اس طرح کرتی ہیں کہ وہ اس موضوع کے سیاق وسباق پر ضرور غور و فکر کرتا ہے۔ زاہدہ حنا کے تیسرے افسانوی مجموعے کے بارے میں انوار احمد رقمطراز ہیں:

''اس کی کہانیوں کی نئی کتاب 'رقصِ بسمل ہے' کی ہر کہانی اذیت اور عقوبت کی زد میں آئے ہر نگر کی کہانی ہے۔ غیروں کی لگائی آگ میں جھلستے اور افغانستان اور عراق کے ساتھ ساتھ اپنوں کے یک چشمِ عدل کی لپیٹ میں آنے والے پاکستان، ایران، بنگلہ دیش اور برما کی روداد بھی اس طرح

> بیان ہوئی ہے کہ طاقت کے زعم میں مبتلا قوتیں اکیسویں صدی میں بھی
> عورتوں اور بچوں کے جسم و جاں کو گھاؤ لگانا ہی اپنی فتح مندی خیال کرتی
> ہیں۔'' [۷]

اتنے سنجیدہ موضوعات کے بیان کے لیے زاہدہ حنا نے سنجیدہ اور علمی اُسلوب اختیار کیا ہے۔ جس میں تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، اساطیر، فارسی اشعار و الفاظ قاری کو جگہ جگہ رُک کر سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں چونکہ ان کے موضوعات سنجیدہ ہیں اور عالمی منظرنامے پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ ان موضوعات کو بیان کرنے کے لیے زاہدہ حنا ایسا اُسلوب اختیار کرتی ہیں جو موضوع کی شدت کو صحیح طور پر قاری پر عیاں کر سکے۔ افسانے کے تمام عناصر ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں اور کسی بھی منفرد طرزِ نگارش کے حامل افسانہ نگار کے لیے یہ چیز بہت ضروری ہے۔ اس بات کو ماریو برگس یوسا 'ناگزیریت' کا نام دیتا ہے اور یوں لکھتا ہے:

> ''ان مصنفین کے اُسلوب ___ ہمیں قائل کر لیتے ہیں تو اس لیے کہ
> یہاں الفاظ، کردار اور اشیاء باہم ایک ناقابل تحلیل وحدت بن جاتے
> ہیں۔ اجزاء کا علاحدہ علاحدہ تصور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ جب میں کہتا
> ہوں کہ کسی بھی تخلیقی نگارش کے لیے ناگزیریت کا حامل ہونا ضروری ہے تو
> اس سے میرا اشارہ اُسلوب اور مظروف کی یہی کامل پیوستگی ہے۔'' [۸]

ستر کی دہائی میں ادیبوں کے ہاں موضوعات اور اسالیب میں غم و غصہ اور جھنجھلاہٹ کا عنصر نمایاں ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ اور مارشل لاء کی فوجی آمریت نے سنجیدہ اور جمہوری اقدار کے حامی ادیبوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ آزادی اظہار پر لگنے والی پابندیوں کے باوجود ادیبوں نے حق کے لیے آواز اُٹھانے کی اپنی ذمہ داری نبھانے کی پوری کوشش کی۔

جمہوریت کی خواہش اور آمریت کے خلاف جدو جہد وہ عوامل ہیں جو زاہدہ حنا کے افسانوں میں ملتے ہیں مارشل لاء کے دور کی تحریر و تقریر پر عائد پابندیوں اور نافرمانی کی صورت میں سخت سزاؤں کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے افسانوں میں علامتی انداز میں احتجاج کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فوزیہ سلیم لکھتی ہیں:

> ''مارشل لاء کے دور میں اظہار پر کڑی پابندیوں کے پیشِ نظر انہوں نے

فوجی آمریت یا مارشل لاء کے دور کا براہِ راست ذکر نہیں کیا بلکہ رمزیہ انداز اختیار کیا۔ اس ضمن میں زاہدہ حنا کے چار افسانے قابلِ ذکر ہیں 'آخری بوند کی خوشبو'، 'بود و نابود کا آشوب'، 'تتلیاں ڈھونڈنے والی'، 'رنگ تمام خوں شد' یہ چاروں افسانے ضیاء دور میں لکھے گئے۔" [۹]

زاہدہ حنا اپنے افسانے "رنگ تمام خوں شد" میں رمزیہ انداز میں حکمرانوں پر یوں تنقید کرتی ہیں:

"نیچے بیٹھے لوگوں میں سے کوئی سر اُٹھا کر دیکھے تو شاید اُسے بھی ہمارے چہروں کی کترنیں نظر آئیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی عذرا کی آنکھوں میں وہ رلیاں گھوم گئیں جو سینکڑوں اور ہزاروں میں بکتی تھیں اور رنگین کپڑوں کی کترنوں سے بنائی جاتی تھیں، لیکن یہ لوگ انسانوں کی کترنوں سے کیا بناتے ہیں؟ دارالامارہ کے قالین شاید انہی کترنوں سے بنتے ہوں۔ حکمرانوں کی قباؤں میں بھی شاید یہی کترنیں استعمال ہوتی ہوں۔" [۱۰]

اُردو کے علامتی افسانے میں یہ قوت تھی کہ اس نے قدیم داستانوں، لوک کہانیوں، حکایتوں، چرند پرند، تاریخی شخصیات کے ساتھ ساتھ اساطیر سے بھرپور استفادہ کیا۔ اساطیر کے سلسلے میں اُردو کے علامتی افسانہ نگاروں نے ہندوستانی اور یونانی اساطیر کے خزانے سے استفادہ کیا۔ مختلف تخلیق کار ایک ہی علامت کو مختلف معنوں اور مختلف انداز سے پیش کرتا ہے۔ زاہدہ حنا اپنے اُسلوب میں اساطیر کے استعمال سے گہری معنویت پیدا کرتی ہیں۔ انہوں نے شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر اساطیر کا استعمال کیا ہے۔ ہر اساطیر اپنا مخصوص پس منظر، خیال، مفہوم اور معنی رکھتی ہے۔ زاہدہ حنا نے عہدِ حاضر کو اساطیر کے ذریعے بیان کر کے افسانوں کی معنویت اور اثر پذیری میں اضافہ کیا ہے۔ زاہدہ حنا کے اساطیر کو اپنے اُسلوب کا حصہ بنانے سے متعلق ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں:

"زاہدہ حنا کا تخلیقی رویہ رومانویت سے جڑا ہوا ہے ان کے افسانوں 'زیتون کی شاخ'، 'صرصر بے اماں کے ساتھ'، 'آنکھوں کے دیدبان'، 'یکے بود یکے نہ بود' میں اساطیری عناصر پائے جاتے ہیں۔" [۱۱]

زاہدہ حنا اپنے افسانے میں اساطیر کا استعمال یوں کرتی نظر آتی ہیں:

''کیپٹن رحیم کے ریوالور نے تولہ بھر سیسا اُگلا اور پندرہ گز دور چبوترے پر ناچتے ہوئے، جھنکارتے ہوئے مور نے جھونک کھائی اس کے لاجوری سبز اور سنہری پر ہوا میں اُڑے اور خون کے چھینٹے اُڑاتا ہوا بدن پھڑکنے لگا وہ طاؤس تھا یا تموز تھا؟ یہ طاؤس کا قتل تھا یا تموز کا؟ تموز کا جس کی موت خزاں کی علامت تھی، جس کا ماتم عشتار کے ساتھ ساتھ تمام کنواریاں اور کسان کرتے تھے۔''[۱۲]

زاہدہ حنا رمزیہ انداز اختیار کر کے اور اساطیر کو ایک نئی معنویت فراہم کر کے اپنے حبس زدہ معاشرہ جس میں حق اور سچ کی ممانعت ہے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں، لیکن اس خوبصورتی سے ظالموں کے خلاف آواز اُٹھاتی ہیں کہ وہ زاہدہ حنا کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتے سوائے ہاتھ ملنے کے۔ محمد علی صدیقی، زاہدہ حنا کے اس فن کا اعتراف ان کے افسانے ''بود و نابود کا آشوب'' کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

''یہ افسانہ عنفوان شباب کی رومان پرستی پر تازیانہ ہی نہیں بلکہ ایک غلط فکر کے خلاف احتجاج بھی ہے اور یہی وہ حاصلِ دانش ہے جسے خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے کہ محتسب وقت بھی دیکھتا اور ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ زاہدہ نے نرم اور دھیمے لہجے میں گھن گرج کے ساتھ سب کچھ کہہ گزرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو وہ کہہ سکتی تھی۔''[۱۳]

اُردو اور فارسی زبان و ادب سے زاہدہ حنا کا بہت گہرا لگاؤ ہے۔ فارسی اور اُردو ادب سے لگاؤ 'زاہدہ حنا' کو ورثے میں ملا ہے وہ اس لگاؤ کا اظہار اپنی تحریروں میں جابجا فارسی اور اُردو اشعار مصرعے اور تراکیب کے استعمال سے کرتی ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں کلاسیکی رنگ نمایاں ہے اسی سے زاہدہ حنا کی تحریر میں گہری معنویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ اُسلوب کی خاص صفت ہے کہ شعراء کے اشعار سے تحریر میں نئی معنویت پیدا کی جائے۔

فارسی اشعار اور لفظیات کا استعمال زاہدہ حنا کے اُسلوب میں وافر ملتا ہے جو فارسی سے نابلد عام قاری کے لیے تو سمجھنا مشکل ہے، لیکن فارسی سے واقف قاری کے لیے زاہدہ حنا کی تحریر

میں لطف ودلچسپی کا عنصر بڑھ گیا ہے۔ فارسی لفظیات کے برمحل استعمال کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''خانم خجستہ کہلاتی ہیں لیکن ہیں بلا کی ستارہ سوختہ، دہفت آسماں یک ستارہ نہ داشتن۔''[۱۴]

اس طرح 'رقصِ مقابر' میں شیخ سعدی کے مصرے سے موجودہ دور کے حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار پر یوں روشنی ڈالتی ہیں:

''کیسا جہاد، کہاں کا جہاد؟ محض فریب نفس، خواہش اقتدار، روحِ زمانہ محمد ظہیر الدین بابر کے وجود میں بل کھاتی ہے۔ سعدی شیرازی نے کہا تھا 'درویش در گلیمے بہ خسپند و دو بادشاہ اقلیمے نہ گنجند' سعدی کے کہنے کے مطابق دو درویش ایک کمبل پر سو سکتے ہیں لیکن دو بادشاہ ایک مملکت میں سانس نہیں لے سکتے۔ تو یہ کیسے درویش ہیں جنہیں اپنے سوا کوئی دوسرا گوارا نہیں۔''[۱۵]

زاہدہ حنا کے ہاں منظر نگاری بہت کمال کی ہے۔ وہ لفظوں کے ذریعے حقیقی تصاویر قارئین کے سامنے کھینچ دیتی ہیں۔ زاہدہ حنا کی جذبات نگاری بھی کمال کی ہے۔ قاری ان جذبات واحساسات کو خود پر گزرتے محسوس کرتا ہے۔ مثلاً 'رانا سلیم سنگھ' میں زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

''میں نے ہال میں دوسرے متعدد لوگوں کے ساتھ قدم رکھا تو سفید دیواروں پر آویزاں روغنی تصویروں سے پھوٹتی ہوئی رنگوں کی تازہ خوشبو کے ساتھ اس کی یاد ایک طوفانی لہر کی طرح آئی ہے اور مجھے شرابور کرتی ہوئی نکل گئی میں اس لمحے ہجوم میں تنہا تھا اور صرف اس کے ساتھ تھا۔''[۱۶]

یوں ہجوم میں موجود تنہا شخص کی تنہائی کو قاری خود پر گزرتا محسوس کرتا ہے۔ زاہدہ حنا کا اُسلوب رواں دواں اور سلیس نہیں ہے۔ اس میں تاریخ، سیاست، فلسفہ، اساطیر، مختلف مذاہب اور مذہبی شخصیات کا جگہ جگہ حوالہ ملتا ہے۔ جس کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص ذہنی سطح کا حامل ہونا قاری کے لیے ضروری ہے۔ عام قاری کے لیے زاہدہ حنا کی تحریر کو سمجھنا مشکل ہے۔ مثلاً 'آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی' میں لکھتی ہیں:

> ''صبح کے سات بج رہے ہیں اچانک دریا کے کنارے سے گولیاں چلتی ہیں۔ وہائیٹ ہاؤس کی کھڑکیوں سے اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ ٹینکوں کے دہانے گولے اُگل رہے ہیں۔ سب مشین گنیں چل رہی ہیں۔ کھڑکیاں ریزہ ریزہ، نچلی منزلوں میں گہری آگ، کچھ فاصلے پر وہ ٹیکری ہے جس پر کھڑے ہوکر نپولین بونا پارٹ نے ماسکو کو جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج ٹیکری پر کوئی نپولین نہیں اور شہر جل رہا ہے۔ کپتان کی بیٹی، مردہ روحیں، اینا کرینے نینا، کراماز وف برادران، بیتے دن اور کنوارے کھیت، جل رہے ہیں حکایتوں کی تفسیریں اور روغنی تصویریں جل رہی ہیں۔ زمین کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی۔'' [۱۷]

اُسلوب مصنف کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے۔ زاہدہ حنا کا مطالعہ بے حد وسیع ہے اور اس کا شوق ان کو وراثت سے ملا ہے۔ زاہدہ حنا اپنے مطالعے سے حاصل کردہ معلومات کو افسانے کے تار و پود میں بُن کر قارئین کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ کہیں کہیں یہ معلومات قاری پر گراں بار گزرتی ہیں کیونکہ افسانہ کی ضخامت بہت مختصر ہوتی ہیں اور وہ زیادہ معلومات کے بیان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ زاہدہ حنا کا شمار ملک کے نامور کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ کالم نگار بہت کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات عام افراد تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے اُسلوب کو کالم نگاری نے کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ ان کے تیسرے افسانوی مجموعے ''رقصِ بسمل ہے'' میں عجلت پسندی اور زیادہ سے زیادہ معلومات کی فراہمی کا انداز نمایاں ہے۔ ان کے پہلے دونوں افسانوی مجموعوں کے اُسلوب میں جو خوبصورتی، دلکشی اور غور و فکر کا عنصر ملتا تھا۔ وہ تیسرے مجموعے میں عجلت کی وجہ سے قدرے کم ہوتا نظر آتا ہے۔

زاہدہ حنا کی کردار نگاری

کسی بھی تخلیق کار کے نقطۂ نظر اور فلسفۂ حیات کا اظہار کرداروں کے ذریعے ہوتا ہے۔ انہیں کرداروں کے ذریعے سے مصنف کے زندگی کی دیکھنے اور برتنے کے انداز کی عکاسی ہوتی ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں کے کردار انتہائی تعلیم یافتہ، باشعور، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھرپور ہیں جو معاشرے کے جبر کے خلاف آواز اُٹھاتے اور بدلے میں ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ متحرک کردار ہیں جو حرکت اور عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ زاہدہ حنا کا زندگی کے بارے میں جو نقطۂ نظر ہے یہ کردار اس کی عملی تفسیر ہیں۔ زاہدہ حنا کا کہنا ہے کہ

> ''زندگی نام ہے حرکت کا، جدوجہد کا۔ اس لیے میں سب سے زیادہ اہمیت جدوجہد کو دیتی ہوں۔ میرے خیال میں حالات کتنے ہی خراب ہوں انسان کو آخری سانس تک لڑتے رہنا چاہیے گھبرانا نہیں چاہیے۔''[۱۸]

زاہدہ حنا کے کردار حالات سے فرار نہیں بلکہ موت سے ٹکرانے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں ان کی شخصیت اور سوچ کرداروں کے ذریعے جھلکتی ہے۔ خاندان کی طرف سے وراثت میں زاہدہ حنا کو بغاوت اور حق کے لیے آواز بلند کرنے کا جو عنصر ملا ہے یہ کردار اس کی تفسیر ہیں۔

زاہدہ حنا اپنے افسانوں میں موضوع اور کردار دونوں کو اہمیت دیتی ہیں۔ کرداروں کے ذریعے وہ موضوع بیان کرتی ہیں۔ ان کے کردار نمایاں حیثیت کے حامل ہیں وہ انہیں معاشرے کو سمجھنے اور اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیتی ہیں۔ یہ کردار باطنی کرب کا شکار ہیں۔ یہ صرف اپنی ذات کے ہی عکاس نہیں بلکہ اس سے اوپر اُٹھ کر اجتماعی شعور کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

زاہدہ حنا کے افسانوں میں سب سے نمایاں کردار جرنلسٹ کا ہے۔ جرنلسٹ کی تعلیم

وتربیت اس طور پر کی جاتی ہے کہ پورا معاشرہ اس کی نظر میں ہوتا ہے۔ وہ معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل اور آنے والی تبدیلیوں کو عام افراد کی نسبت پہلے بھانپ لیتا ہے۔ زاہدہ حنا خود بھی صحافت سے وابستہ ہیں۔ اس لیے اس کردار کی نگاہ کی وسعت اور گہرائی سے واقف ہیں۔ وہ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے کئی دوسرے ممالک میں انسانی زندگیوں پر دہشت ناک ماحول اور بڑھتی ہوئی جنونیت کے اثرات اسی کردار کے ذریعے دکھاتی ہیں۔

رپورٹر ایک بلند جگہ پر کھڑا ہو کر پورے معاشرے پر نظر ڈالتا اور معاشرے کی سب سے اہم مخلوق یعنی انسان کے داخلی و خارجی کرب پر نگاہ رکھتا ہے۔ لالہ دانیال (جاگے ہیں خواب میں) جو پاکستان کی طرف سے عراق کی رپورٹر ہے اور عراق کے دلدوز مناظر دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے۔ نجیب (بہ ہر سو رقصِ بسمل بود) جو کراچی کا رپورٹر ہے۔ عرفان (تقدیر کے زندانی) جو رنگون کی تباہی و بربادی اور بھکشوؤں کے پُرامن احتجاج پر ہونے والے مظالم کو موضوع بناتا ہے (رنگ تمام خوں شُد) کی عذرا اور ثمینہ۔ یہ تمام کردار مظلوم اور بے بس انسانوں کی محبت میں مبتلا ہیں۔

زاہدہ حنا کے ہاں بے باک اور بے خوف لکھنے والے ادیب کردار ہیں جنہوں نے سچ اور حق کے لیے آواز اُٹھائی اور ساری عمر اسی روش پر قائم رہے۔ مصیبتوں، مظالم کو برداشت کیا، لیکن ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زاہدہ حنا کا افسانہ 'پانیوں پر بہتی پناہ' میں کندن حسین کا کردار بنگالی ادیبہ تسلیمہ نسرین ہے۔ تسلیمہ نے معاشرے کے مروجہ سماجی اور مذہبی سانچوں کے خلاف آواز بلند کی اور بدلے میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ اس پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا، لیکن اس نے قلم کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ زاہدہ حنا اس کے بے خوف اندازِ تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

> ''دس لاکھ برس پہلے ظاہر ہونے والے انسان کی ہزار ہا نسلیں کندن حسین کے سامنے سے ماتم کرتی ہوئی گزر گئیں۔ ہم مٹی میں ملائے گئے، ہم آگ میں جلائے گئے، ہم پانی میں بہائے گئے ___ سب ہی چلے گئے تھے، سب کو چلے جانا تھا، کائنات کا دل بہلانے کے لیے۔ کوئی دوسری کائنات نہ تھی۔ وقت کی دوسراہٹ کے لیے کوئی دوسرا وقت موجود نہ تھا

جب کائنات اور کہکشائیں اور کواکب تنہا ہیں اور مر رہے ہیں تو پھر کندن حسین تمہاری کیا حیثیت، کیا حقیقت ہے تم تنہائی سے اور موت سے کیوں خوفزدہ ہو ___ مقدر سے بھلا کیا ڈرنا۔'' [۱۹]

زاہدہ حنا کے تمام کردار اسی فلسفے کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ دراصل زاہدہ حنا ادیبوں کو اُن کی اس ذمہ داری کا احساس دلانا چاہتی ہیں کہ موت ہر کسی کو آنی ہے۔ فنا ہر کسی کا مقدر ہے تو پھر انسانیت کی خدمت کر کے ظلم کے خلاف احتجاج کر کے اور مظلوم کا ساتھ دے کر اپنی موت کو امر کر دینا چاہیے۔ بہادری سے زندگی گزارنی چاہیے نہ کہ ڈر ڈر کے خوف کے ساتھ۔

زاہدہ حنا اپنے ان بہادر کرداروں کو حوصلہ دینے کے لیے تاریخ کی شخصیات کا حوالہ دیتی ہیں کہ تاریخ بہادروں کو کبھی نہیں بھولتی۔ افسانے 'جسم و زباں کی موت سے پہلے' میں عباس کا کردار ہے جو ظلم کے خلاف لکھنے اور آواز بلند کرنے کی پاداش میں قید ہے۔ تمام مظالم کو بہادری سے برداشت کرتا ہے۔ زاہدہ حنا اس کردار کو حوصلہ دینے کے لیے ماضی میں سان تیاگو کے نیشنل اسٹیڈیم میں ہونے والے واقعے کا حوالہ دیتی ہیں۔ وکٹر جارا جو چلی کا اُستاد تھیٹر ڈائریکٹر، شاعر، گلوکار اور میوزک ڈائریکٹر تھا۔ سیاسی ایکٹیوسٹ اور کیمونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ لکھنے کی سزا کے طور پر اس کی انگلیوں کو چاپڑ سے گاجر، مولی کی طرح کاٹ دیا گیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت اس اسٹیڈیم میں طرح طرح کی اذیتیں دے کر مارا گیا۔ اس نے اپنے آدرش کے لیے جان دے دی، لیکن وفاداری تبدیل نہیں کی۔ اس کی موت نے اسے اور اس کے نظریات کو حیاتِ ابدی عطا کی۔

زاہدہ حنا کے تمام کردار جس بھی شعبے یا پیشے سے وابستہ ہیں۔ اس سے جنوں کی حد تک لگاؤ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے پیشے کو روح میں اُتارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً 'رانا سلیم سنگھ' کا سلیم جو تصویری آرٹ سے وابستہ ہے اور اس پیشے سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھتا ہے۔ موجودہ عہد کی زندگی کی تلخیوں کو اپنے آرٹ کا موضوع بناتا ہے۔ قدیم اور جدید آرٹ کے فرق کو بتاتے ہوئے موجودہ عہد کی زہرناکی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

''زندگی کو دیکھنے کا ہر آدمی کا اپنا ڈھب ہوتا ہے جو اسے کڑوا یا میٹھا بنا دیتا ہے۔ پہلے کے آرٹسٹوں کی تصاویر میں کڑواہٹ اول کم ہوتی تھی اور اگر ہوتی تو مٹھاس بھی ساتھ ہوتی تھی۔ بدصورتی ان کے ہاں حُسن کے سائے

میں ہوتی تھی، لیکن ہمارے زمانے میں تو مٹھاس جیسے زندگی کی تہہ میں بیٹھ گئی ہے۔" [۲۰]

زاہدہ حنا کا کوئی کردار زندگی سے فرار حاصل کرتا نظر نہیں آتا چاہے کسی بھی پیشے سے وابستہ ہو۔ اس طرح 'گُم گُم بہت آرام سے ہے' افسانے کی گُم گُم جو افغانستان میں بحیثیت ڈاکٹر تعینات ہے۔ 'یکے بود یکے نہ بود' کا شاہ پور جو مٹی کے برتن بنانے میں ماہر ہے۔ 'پانیوں پر بہتی پناہ' کی کندن حسین جو لکھاری ہے، 'بہ ہر سو رقصِ بسمل بود' کا نجیب جو رپورٹر ہے اور رپورٹنگ کرتے ہوئے جان کی بازی ہار جاتا ہے۔

زاہدہ حنا کے نسوانی کردار ہمت و بہادری میں مردوں سے کسی طور پر کم نظر نہیں آتے۔ اُن کے افسانوں میں عورت، مرد کے شانہ بشانہ اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف نظر آتی ہے۔ مثلاً ''تتلیاں ڈھونڈنے والی'' کی نرجس جو موت کو تو قبول کر لیتی ہے لیکن رحم کی اپیل کو اپنے لیے پسند نہیں کرتی کہ یہ اس کے آدرش کے خلاف ہے۔

زاہدہ کے ہاں 'ماں' کا کردار بھی بہت اہم ہے۔ ماں سے مُراد کسی ایک خطے، علاقے یا نسل سے تعلق رکھنے والی نہیں بلکہ آفاقی خصوصیات کا حامل یہ کردار ہمارے سامنے آتا ہے۔ ماں کا تعلق جہاں سے بھی ہو اولاد کے لیے ایک ہی طرح کے جذبات و احساسات رکھتی ہے۔ اپنی اولاد کے لیے ہر دم دُعا گو، اس کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ جانے ولی ماں، چاہے وہ ماں امریکن فوجی ایڈگر کی ہو، مہدی کی ماں نرجس ہو، ایرانی ماں خجستہ خانم ہو یا کراچی کے نجیب کی ماں ہو یا گُم گُم کی ہندوستان میں رہنے والی ماں۔ اس کردار کی آفاقیت کو زاہدہ حنا نے بہت موثر انداز میں بیان کیا ہے کہ دُنیا کی تمام ماؤں کے دل شاید ایک ہی خمیر سے اُٹھائے جاتے ہیں۔ [۲۱]

زاہدہ حنا کے ہاں وفادار نوکر کا کردار تقریباً ہر افسانے میں ملتا ہے۔ یہ وہ کردار ہیں جو تقریباً اب ناپید ہیں۔ ایسے نمک خوار اور وفادار ملازم ملنا اب ممکن نہیں۔ 'ناکجا آباد' میں بُوا کے کردار کی وفاداری کو زاہدہ حنا یوں بیان کرتی ہیں:

''وہ خون جس کا سفر سہسرام سے شروع ہوا تھا اور جہلم کی مٹی میں آسودۂ خاک ہوا اس خون کا نمک بُوا اور ان کی اولادوں کے بدن میں اتنی دُور تک اُتر گیا کہ اب ان کے خوابوں میں بھی اس خون کی سوگ نشیں یادیں

ہیں۔'' [۲۲]

یہ کردار صرف وفادار ہی نہیں بلکہ وقت پڑنے پر حوصلہ دیتے اور ہمت بندھاتے نظر آتے ہیں۔ 'پانیوں پر بہتی پناہ' کا رحیم چاچا، 'معدوم ابنِ معدوم' کا 'مرلی دھر'، 'یہ ہر سو رقصِ بسمل بود' کا بخشو بھیا وغیرہ۔

زاہدہ حنا کے کردار اپنے آبائی وطن اور شہر کی محبت میں گرفتار ہیں۔ وہ سرحدوں سے قطع نظر اپنے علاقوں، اپنی زمین کو روح میں بسائے نظر آتے ہیں۔ ماضی پرستی کا رجحان دیگر اہلِ زباں کی طرح زاہدہ حنا کے ہاں بھی نمایاں ہے۔

زاہدہ حنا کے کردار اپنی صفات وکردار میں انتہائی اعلیٰ درجے کے ہیں اور زندگی کے ہر معاملے میں ثابت قدم نظر آتے ہیں۔ یہی ان کے کرداروں کی سب سے بڑی خامی بھی ہے۔ ان کے ہاں تنوع نہیں یک رُخا پن ہے۔ یہ کردار زندگی کے بہت قریب نظر نہیں آتے۔ آخری مجموعے ''رقصِ بسمل ہے'' کے بعض کردار سپاٹ نظر آتے ہیں جو اپنی ذات، جذبات واحساسات کو بھلا کر صرف سیاست اور استحصال کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں۔

زاہدہ حنا کے پہلے دو مجموعوں ''قیدی سانس لیتا ہے'' اور ''راہ میں اجل ہے'' کے کرداروں میں زندگی کی لہر ملتی ہے۔ ان مجموعوں کے کرداروں کی زبان سے زاہدہ حنا نے جو کہلوایا ہے وہ دراصل وہی سوچیں اور کیفیات ہیں جو خود ان کے دل ودماغ میں گونجتی ہیں۔ یہ سب انسانی رشتوں، ناطوں میں اپنی تہذیبی زندگی کے خدوخال ڈھونڈتے کردار یا بدلتے ہوئے وقت میں اپنے تہذیبی وجود کی اصل کو تلاش کرتے ہوئے کردار ہیں جو اپنے تہذیبی شعور سے کام لے کر حال میں زندگی کے نئے اسرار ورموز سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کرداروں پر زاہدہ حنا نے کافی سوچ وچار کی ہے۔ ایسے کردار زندگی میں مل جاتے ہیں، لیکن زاہدہ حنا کے آخری افسانوی مجموعے کے بعض کردار اُن کے نظریات کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔

کردار نگاری کے بارے میں کیے گئے سوال کے جواب میں زاہدہ حنا کہتی ہیں:

''میں نہیں سمجھتی کہ کردار خود پر طاری کیے جاسکتے ہیں۔ وہ ہمارے ذہن میں آتے ہیں اور پھر سوچتے رہنے کے عمل کے دوران ہمارے اندر حلول کر جاتے ہیں۔ ان پر ہمارا اختیار نہیں رہتا وہ ہم پر قبضہ کر لیتے ہیں اور

ہمارے قلم سے اپنا آپ لکھواتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں تو ہم ہنستے ہیں وہ عذاب سے گزرتے ہیں تو ان کے آنسو ہماری آنکھوں سے بہتے ہیں۔"[۲۴]

لیکن زاہدہ حنا کے آخری افسانوی مجموعے کے کرداروں پر خود ان کی ذات حاوی دکھائی دیتی ہے۔ انہیں کی ذات کا عکس ان کرداروں میں نظر آتا ہے۔ افسانہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ تخلیق کار اپنے خیالات و نظریات کو اس طرح بیان کرے کہ وہ تخلیق کے ساتھ گھل مل جائے۔ فطری انداز میں بات کرے اور اس کا موضوع قاری کے سامنے خود بخود واضح ہو جائے اور قاری کو اپنی گرفت میں لے لے، لیکن زاہدہ حنا کے آخری افسانوی مجموعے کے کرداروں میں نظریات کا رچاؤ اور رساؤ کم نظر آتا ہے اور اس کی ایک وجہ صحافت سے اُن کی وابستگی بھی ہو سکتی ہے۔

متنوع تکنیکوں کا استعمال

فرائیڈ کے نظریہ لاشعور نے دُنیا کو اس بات کا شعور دیا کہ انسان بیک وقت دو دُنیاؤں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک شعور کی دُنیا جو نگاہوں کے سامنے ہے اور دوسری لاشعور کی دُنیا جو کہ نظروں سے پوشیدہ اور اوجھل ہے۔ ادب کی دنیا میں تخلیق کار لاشعور کی دُنیا کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس تک رسائی کے لیے مختلف تکنیکوں کا استعمال کرتے ہیں تاکہ لاشعور کی دُنیا میں پنہاں حقائق کو منظرِ عام پر لایا جاسکے۔

ا۔ شعور کی رَو:

شعور کی رَو فکشن کا بہت اہم حصہ ہے۔ اس کے پیچھے فرائیڈ کے نظریات اور بیسویں صدی کے معروضی حالات کا گہرا اثر ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد انسان ایک نئے موڑ پر آن کھڑا ہوا۔ معاشی ابتری، تہذیبی انحطاط اور معاشرتی اقدار وروایات کی شکست وریخت عمل میں آئی جس کی بدولت انسان اپنے ظاہر کی بجائے باطن کی طرف متوجہ ہوا۔ شعور کی رو کے ذریعے تخلیق کار کرداروں کے باطن میں پنہاں حقائق کا فنکارانہ اظہار کرتا ہے۔

شعور کی رو کسی خاص واقعے کی ماضی، حال، مستقبل کے تجربے کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے رواں دواں رہتی ہے۔ یعنی کسی واقعے کا جو ذہن کو تحرک دینے کا باعث ہو۔ مختلف زمانوں میں اس کا ربط اور یہ تمام زمانے ایک دوسرے سے جُڑے ہوتے ہیں۔ یہ واقعات یا خیالات ماضی، حال اور مستقبل کی زمانی اور منطقی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے لمحہ موجود میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے تحرک کا باعث بنتے ہیں اور ایک دوسرے سے جُڑے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش شعور کی رو کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''شعور کی رو خیالات کے اس جنگل کو سامنے لاتی ہے جو انسانی ذہن میں خود رو یا ان خیالات اور تصورات سے پٹا پڑا ہوا ہے جو معروضی

حالات اور سماجی کیفیت سے مل کر پیدا ہوتے ہیں۔اس جنگل میں آدمی گم
ہو جاتا ہے اور وہ حالات اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں جو آدمی کو گم کرنے کا
سبب ہوتے ہیں۔'' [۲۴]

زاہدہ حنا نے اس تکنیک کا فنکارانہ انداز میں استعمال اپنے افسانوں میں کیا ہے۔ وہ کسی چیز کی مشابہت کے باعث ماضی اور حال میں ربط تلاش کرتی اور تاریخ کے وسیع موضوع کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتی ہیں۔ شعور کی رو سے وابستہ دو تکنیکوں کا زاہدہ حنا نے بہت زیادہ استعمال کیا ہے؛

ا۔ فلیش بیک(Flash Back) ۲۔ خود کلامی

فلیش بیک (Flash Back):

خیالات کا حال سے ماضی اور ماضی سے حال تک کا سفر فلیش بیک ہے جو شعور کی رو کے تحت کام کرتا ہے۔اس میں کرداروں کے ذریعے سے تخلیق کار اُن واقعات کو بیان کرتا ہے جن کا تعلق ماضی سے ہے اور خیالات کے ذریعے سے حال سے ماضی میں سفر کر کے کردار وہاں تک پہنچے تو یہ فلیش بیک ہے۔ فلیش بیک کے ذریعے کردار کا حال ماضی سے منسلک ہو کر معنویت کی نئی راہ فراہم کرتا ہے۔اس سے تخلیق کار وہ گہرائی اور معنویت اپنی تخلیق میں حاصل کر سکتا ہے جو صرف حال کے بیان سے ممکن نہیں۔

زاہدہ حنا کو تاریخ سے بہت لگاؤ ہے۔انہوں نے ہزاروں سال کی تاریخ اور فلسفیانہ علم سے اکتساب کیا ہے اور اسے اپنے افسانوں کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔تاریخ کے وسیع موضوع کو اسی تکنیک کے ذریعے زاہدہ حنا حال سے جوڑ کر وقت کے تسلسل میں آج کے حالات و واقعات کو دیکھتی اور اپنی رائے کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔

زاہدہ حنا کو شیعہ مت سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ ایران کے زرتشت مذہب کو بہت پسند کرتی ہیں اور اپنی تحریروں میں اس لگاؤ کا جابجا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ زرتشت مذہب کے حامیوں کو ایران کی فتح کے بعد کس طرح مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا۔ان کو کس طرح اپنی زمینوں سے اُٹھا کر دیگر زمینوں پر زبردستی آباد کیا گیا۔تاریخ کے ساڑھے تیرہ سو سال قبل کے اس

تاریخی موڑ کو اپنے افسانوں میں فلیش بیک کے ذریعے زاہدہ حنا نے بیان کیا ہے۔ اپنے افسانے ''صرصر بے اماں کے ساتھ'' میں لکھتی ہیں:

> ''آج اس جہاز کو دیکھ کر مجھے اپنے جدِ اعلیٰ بہروز پور ہرمز کی یاد آ رہی ہے جو شیز میں شاہانِ ایران کے مخصوص آتش کدے 'آذرخش' کے ایک موبد تھے اور جنھوں نے شیز پر مسلمانوں کے قبضے کے وقت دیگر موبدوں کے ساتھ ہند کی جانب فرار ہونے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ ان کے ساتھی مارے گئے اور وہ غلام بنا لیے گئے۔'' [۲۵]

فلیش بیک کی تکنیک وقت کی سیدھی سادھی تقسیم کو توڑتی ہے، حال اور ماضی کے درمیان کے فاصلوں کو کم کرتی ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانے 'رانا سلیم سنگھ' میں احمد مسعود جو کہ بہت اعلیٰ عہدے پر فائز ہے، لیکن اندر سے بے چین ہے۔ اس کی بے چینی کی وجہ رانا سلیم سنگھ کی باتیں سن کر بہت شدّت سے اپنے ماضی کا یاد آ جانا ہے۔ فلیش بیک کی تکنیک کے استعمال سے زاہدہ حنا نے اس کا ماضی قاری کو دکھایا ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''یہ میں تھا جو گنگناتا ہوا جا رہا تھا۔ یہ میں تھا جو بوجھل قدموں سے اپنے فلیٹ میں واپس آیا اور ایش ٹرے کے نیچے رکھے ہوئے کاغذ کے اس پُرزے کو اُٹھا کر دیکھتا رہا جس پر اس نے اپنا پتا لکھا تھا یہ میرا پتا تھا۔ اس احمد مسعود کا پتا جس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے برسوں پہلے چھوٹ گیا تھا۔ اس کی یاد تو مجھے نہ جانے کب سے نہیں آئی تھی اور اب جبکہ وہ اپنی جھلک دکھا کر چلا گیا تھا تو میرے دل پر آرے چل رہے تھے۔'' [۲۶]

داخلی خود کلامی:

فن کار کردار کے باطن کی دُنیا کو جاننے کے لیے داخلی خود کلامی کا استعمال کرتا ہے جو شعور کی رَو سے وابستہ ہے۔ داخلی خود کلامی کسی منظر میں کردار کی ایسی گفتگو ہوتی ہے جس کا مقصد کسی قسم کے تبصرے کے بغیر اور تخلیق کار کی مداخلت کے بغیر ہمیں اس کردار کی اندرونی کیفیت سے متعارف کراتا ہے۔

داخلی خود کلامی، بے تکلف اظہار کی بدولت لاشعور کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ فنکار کردار کے صرف داخل تک ہی رسائی حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا رشتہ خارجی عوامل سے بھی جوڑتا ہے، لیکن اس طرح کہ بے ساختگی اور برجستگی قائم رہے۔ تکلف یا بناوٹ کا احساس نہ ہو۔

زاہدہ حنا نے داخلی خود کلامی کا اپنے افسانوں میں بہت استعمال کیا ہے۔'نا کجا آباد' میں زاہدہ حنا کا سوانحی رنگ جھلکتا ہے۔ زاہدہ حنا پیدائش کے فوراً بعد اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گئیں اور کراچی آباد ہوئیں۔ ان کو اپنے آبائی وطن، اپنی زمین سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اس چیز کا اظہار داخلی خود کلامی کے ذریعے بڑے فنکارانہ انداز میں یوں کرتی ہیں:

> ''جب ان ستونوں اور محرابوں پر، دروں پر اور دیواروں پر میری نظر پڑتی ہے تو مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے وہ گھر جو مجھ سے زیادہ یہاں باتیں کرنے والوں کا گھر ہے، لیکن جسے اس بوڑھے کے سوا سب بھول چکے ہیں یہ باتیں اگر میں با آواز بلند سوچنے لگوں تو یہ لوگ قہقہے مار کر ہنسیں گے اور مجھ سے پوچھیں گے کہ کس گھر کی باتیں کرتی ہو، تمہارا گھر تو یہ ہے جس کے چبوترے سے ٹیک لگائے تم کھڑی ہو اس کے سوا تمہارا گھر بھلا کہاں ہے؟ اور ان لوگوں کو ہنسنا ہی چاہیے کیونکہ انہیں نہیں معلوم کہ گھر اینٹوں سے بنی ہوئی چار دیواری، چھت اور کمروں کا نام نہیں۔ گھر تو وہ جگہ ہے جو ہمارے اندر بسی ہوئی ہو۔'' [۲۷]

اسی طرح ایک اور افسانے ''آنکھوں کے دیدبان'' میں داخلی خود کلامی کا بہت شاندار نمونہ ملتا ہے۔ عورت کی تربیت ہی ان خطوط پر کی جاتی ہے کہ وہ چاہ کر بھی اپنی ذات کو آزاد نہیں کر سکتی۔ وہ اپنی ذات کے حصار میں ہی مقید رہتی ہے۔ لکھتی ہیں:

> ''لیکن جب میں اس کی طرف چلنا چاہتی ہوں تو میرے پیر نہیں اُٹھتے اور تب مجھے یاد آتا ہے کہ میرا نچلا دھڑ تو گردباد کا ہے اور مجھے شفاف دیواروں والے اس حصار میں قید کر دیا گیا ہے باہر دروازے پر میری سیاہ آنکھیں پہرا دیتی ہیں اور ان کی چمک میرے اعصاب کو سُلا دیتی ہے۔'' [۲۸]

داخلی خود کلامی کی تکنیک سے جنم لینے والے کردار داخلی سطح پر متحرک اور فعال ہوتے ہیں، لیکن خارجی سطح پر زیادہ متحرک نہیں ہوتے۔ شعور کی رو میں خیالات کا ایک بہاؤ ہوتا ہے جو ایک چیز سے دوسری اور دوسری چیز سے تیسری چیز میں منتقل ہوتا جاتا ہے اور تخلیق کار انہیں گُم کرنے والے اسباب کا کھوج 'شعور کی روٗ' کی تکنیک کے ذریعے کرتا اور قارئین کے سامنے لاتا ہے۔

زاہدہ حنا نے اپنے افسانوں میں جہاں جہاں ماضی کی یادوں کو دوہرایا اور تاریخ کو بیان کیا ہے وہاں شعور کی رو کا استعمال کیا ہے اور اس کے استعمال سے زاہدہ حنا نے جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ اُن کا اطلاق حال پر کرتی نظر آتی ہیں۔ حال کے تجربات و مشاہدات کو وہ حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ یوں ماضی کو حال سے جوڑ کر معنویت کی نئی راہیں فراہم کرتی ہیں۔

داخلی خود کلامی کی تکنیک سے جنم لینے والے کردار داخلی سطح پر متحرک اور فعال ہوتے ہیں، لیکن خارجی سطح پر زیادہ متحرک نہیں ہوتے۔ شعور کی رو میں خیالات کا ایک بہاؤ ہوتا ہے جو ایک چیز سے دوسری اور دوسری چیز سے تیسری چیز میں منتقل ہوتا جاتا ہے اور تخلیق کار انہیں گُم کرنے والے اسباب کا کھوج 'شعور کی رو' کی تکنیک کے ذریعے کرتا اور قارئین کے سامنے لاتا ہے۔

زاہدہ حنا نے اپنے افسانوں میں جہاں جہاں ماضی کی یادوں کو دوہرایا اور تاریخ کو بیان کیا ہے وہاں شعور کی رو کا استعمال کیا ہے اور اس کے استعمال سے زاہدہ حنا نے جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ اُن کا اطلاق حال پر کرتی نظر آتی ہیں۔ حال کے تجربات و مشاہدات کو وہ حقیقت پسندانہ انداز میں بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ یوں ماضی کو حال سے جوڑ کر معنویت کی نئی راہیں فراہم کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مرزا خلیل بیگ، ڈاکٹر: ''زبان، اُسلوب اور اسلوبیات''، علی گڑھ، ادارۂ زبان و اُسلوب، ۱۹۸۳ء، ص ۱۵۷۔

۲۔ عابد علی، عابد: ''اسلوب''، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۶ء، ص ۴۱۔

۳۔ ماریو برگس یوسا: ''نوجوان ناول نگار کے نام خط'' (مترجم) محمد عمر میمن، کراچی، شہرزاد پبلشرز، ۲۰۱۰ء، ص ۴۳۔

۴۔ زاہدہ حنا: ''جاگے ہیں خواب میں''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸۰،۱۸۱۔

۵۔ انتظار حسین: فلیپ ''قیدی سانس لیتا ہے''۔

۶۔ زاہدہ حنا: ''ناکجا آباد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۔

۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر: فلیپ ''رقصِ بسمل ہے''

۸۔ ماریو برگس یوسا: ''نوجوان ناول نگار کے نام خط''، ص ۴۰۔

۹۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر: ''اُردو افسانے میں اُسلوب اور تکنیک کے تجربات''، ۲۰۱۰ء، اسلام آباد، یورپ اکادمی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۴۔

۱۰۔ زاہدہ حنا: ''رنگ تمام خوں شُد'' مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۵۸۔

۱۱۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر: ''اُردو افسانے میں اُسلوب اور تکنیک کے تجربات''، ص ۴۲۸۔

۱۲۔ زاہدہ حنا: ''رنگ تمام خوں شُد'' مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۶۷۔

۱۳۔ محمد علی صدیقی: فلیپ 'قیدی سانس لیتا ہے''

۱۴۔ زاہدہ حنا: ''بہ ہر سو رقصِ بسمل بود''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۹۷۔

۱۵۔ زاہدہ حنا: ''رقصِ مقابر''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۸۹۔

۱۶۔ زاہدہ حنا: ''رانا سلیم سنگھ''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۱۹۔

۱۷۔ زاہدہ حنا: ''آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے'' ص ۱۵۔

۱۸۔ راقمہ سے ٹیلی فونک گفتگو بتاریخ ۱۶ ستمبر ۲۰۱۴ء، بہ وقت ۴:۱۵۔

۱۹۔ زاہدہ حنا: ''پانیوں پر بہتی پناہ''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۳۴۔

۲۰۔ زاہدہ حنا: ''رانا سلیم سنگھ''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۲۶۔

۲۱۔ زاہدہ حنا: ''زیتون کی ایک شاخ''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۳۲۔

۲۲۔ زاہدہ حنا: ''ناگجا آباد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۹۔

۲۳۔ راقمہ سے ٹیلی فونک گفتگو۔

۲۴۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر: ''جدید اُردو افسانے کے رجحانات''، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۲۔

۲۵۔ زاہدہ حنا: ''صرصر بے اماں کے ساتھ''، ص ۵۵۔

۲۶۔ زاہدہ حنا: ''رانا سلیم سنگھ''، مشمولہ ''رقصِ بسمل ہے''، ص ۱۳۰۔

۲۷۔ زاہدہ حنا: ''ناگجا آباد''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۱۰-۱۱۔

۲۸۔ زاہدہ حنا: ''آنکھوں کے دیدبان''، مشمولہ ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، ص ۷۵-۷۶۔

باب چہارم:

زاہدہ حنا کی ناولٹ نگاری

(فکری وفنی جائزہ)

زاہدہ حنا کی ناولٹ نگاری

(فکری وفنی جائزہ)

ناولٹ کو بالعموم چھوٹا ناول یا ناول کی تصغیری شکل سمجھا جاتا ہے جو درست رویہ نہیں۔ ہم ناول، ناولٹ اور مختصر افسانہ کے درمیان طوالت اور اختصار کی بنیاد پر تفریق کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی صنفی خوبیاں اور شناخت اُبھر کر سامنے نہیں آ پاتی۔ اس لیے شاید ممتاز شیریں نے کہا تھا کہ

> ''روایتی اعتبار سے ہم فکشن کی قسموں میں مختصر افسانے سے طویل مختصر افسانے اور ناولٹ سے ناول تک بتدریج زیادہ وسعت و گہرائی، وسعت مکانی، طویل تر دورانِ زمانی، بڑے کینوس اور بھرپور زندگی کی پیش کش کی توقع رکھتے ہیں۔'' [۱]

اصل میں ناول کی طوالت اور ناولٹ کا اختصار ان کی صنف کے تقاضے ہیں۔ اگر ہم ان تقاضوں کو نہ سمجھ سکیں تو محض اختصار کی بنیاد پر کسی فن پارے کو ناولٹ نہیں کہہ سکتے ورنہ اگر کوئی ہمارے سامنے War and Peace کا خلاصہ رکھ دے تو ہم اسے ناولٹ قرار دے دیں گے جو صریحاً غلط ہوگا۔ طویل ناولوں کے مختصر خلاصے ناولٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ ناولٹ کی اپنی الگ شعریات ہے جسے برتے بغیر ناولٹ، ناولٹ نہیں بن سکتا اور ناولٹ کا فن یا شعریات کیا ہے؟ اس پر ڈاکٹر سلیم اختر کی یہ وضاحت کافی غور طلب ہے جس پر نگاہ ڈالے بغیر آگے بڑھنا دُشوار ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

> ''ادیب ناول میں وسیع کینوس پر زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے تمام ممکنہ تفصیلات کو بروئے کار لاتے ہوئے افراد اور ماحول کے باہمی عمل اور ردِعمل سے جنم لینے والے متنوع حالات اور گوناگوں کیفیات کا تفصیلی

جائزہ لیتا ہے۔ اس صورت میں بالعموم تخلیقی توانائی کا اظہار اور پھیلاؤ
وسعت سے ہوتا ہے، لیکن جب کینوس محدود ہو تو پھر تخلیقی توانائی پھیلاؤ
سے نہیں بلکہ گہرائی سے اظہار پاتی ہے یہ گہرائی شدتِ تاثر کو جنم دے کر
زندگی پر ایک مخصوص اور انفرادی زاویہ سے روشنی ڈالتی ہے۔ یہی ناولٹ کا
فن ہے ناول میں بھی زندگی پر روشنی ڈالی جاتی ہے، لیکن ناول نگار روشنی
کے سیلاب سے کام لیتا ہے جب کہ ناولٹ میں روشنی تو ہے لیکن روشنی کا
سیلاب نہیں۔ یہ ادیب کا کمال ہے کہ وہ ناولٹ میں روشنی ایسے زاویہ سے
برتتا ہے کہ کم روشنی بھی کافی ثابت ہوتی ہے بلکہ کم روشنی اس کی تکنیک میں
اہم ترین عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔" [۲]

اصل میں ناول کی وسعت اور پھیلاؤ ہر طرح کی تفصیلات کا طالب ہوتا ہے۔ خاص طور پر ماحول کی مکمل تصویر کشی، کرداروں کی نفسیاتی اُٹھان، طویل مکالے بلکہ حسبِ موقع تقریریں تک۔ یہ سب ناول میں سما سکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ "اعتدال اور توازن کے ساتھ ساتھ موقع محل کا بھی لحاظ رکھا جائے۔" [۳] مثلاً جو موقع یا کردار روشنی کا سیلاب چاہتا ہے اس پر مکمل طور سے روشنی ڈالی جائے، لیکن اس ضمن توازن کا خیال لازم ہے ورنہ نتیجہ اُکتاہٹ فنی اسقام اور خام کاری کی صورت میں ظاہر ہوگا، مگر ناولٹ نگار کو اتنی آزادی نہیں "وہ افسانہ نگار کی مانند کفایت سے کام لینے پر مجبور ہے اس لیے اس کا فن تفصیلات نہیں بلکہ جزئیات نگاری چاہتا ہے۔" [۴]

یہاں یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ تفصیلات اور جزئیات کے فن میں کیا فرق ہے کیونکہ یہی فرق ناولٹ اور ناول کی تفریق کو خاص طور پر واضح کرتا ہے۔ اس کو ایک کمرہ کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی مصنف کمرہ کی تمام اشیاء کی تفصیل سے چاہے وہ ضروری ہوں یا غیر ضروری، کمرے کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرے تو یہ طریقہ تفصیل نگاری کی ذیل میں آئے گا جبکہ کمرے میں سے ایسی دو چار اشیاء کا تذکرہ، جس کے لیے انتخاب کے عمل سے گزرا گیا ہو اور جو کمرے کا نقش ذہن پر بٹھا دے جزئیات نگاری کا فن کہلائے گا۔ جزئیات نگاری ایک مشکل فن ہے کہ اس میں مصنف کی فنی ریاضت کا امتحان زیادہ کڑا ہوتا ہے۔ اس میں مصنف اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب مشاہدے کی گہرائی اور اشیاء اور افراد کے باہمی رشتے کی تفہیم کے ساتھ

ساتھ اشاراتی اندازِ بیان پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ دوستوفسکی کا 'جواری' اس کی عمدہ مثال ہے جسے ناولٹ کہا جاسکتا ہے۔ دوستوفسکی جو ناول کی دنیا میں تفصیل پسندی کی وجہ سے جانا اور پہچانا جاتا ہے اور اس ذیل میں اس کے دوشاہکار 'ایڈیٹ' اور 'برادرز کرامازوف' مشہور ہیں جبکہ 'جواری' لکھتے ہوئے اس پر جزئیات نگاری کا فن غالب آ گیا اور اسی لیے 'جواری' کو اس واضح فرق کی بنیاد پر دوستوفسکی کا ناول نہیں بلکہ ناولٹ قرار دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں ناولٹ کا فنی شعور اس طرح پختہ نہیں ہو سکا جیسا مغرب میں ہے۔ ہمارے بیشتر ناولٹ نگار اپنے ناولٹ کو ناول ہی سمجھتے ہیں اور ناقدین بھی واضح فرق نہ کرنے کی وجہ سے دونوں میں امتیاز نہیں کرتے۔ راجندر سنگھ بیدی کے 'ایک چادر میلی سی' کو کوئی ناولٹ بتاتا ہے تو کوئی ناول۔ اسی طرح کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے ناولوں میں سے کئی ناولٹ کے زُمرے میں آتے ہیں، مگر ان سب کو بلا تخصیص ناول ہی شمار کرلیا جاتا ہے۔ اسی طرح سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات' کا معاملہ ہے، لیکن اس ضمن میں قرۃ العین حیدر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ شعوری طور پر تفریق کرسکتی ہیں کہ اگر 'آگ کا دریا'، 'آخرِ شب کے ہمسفر' یا 'گردشِ رنگِ چمن' ان کے ناول ہیں تو 'سیتا ہرن'، 'چائے کے باغ'، 'دِلرُبا' اور 'اگلے جنم موہے بِٹیا نہ کیجو' ان کے ناولٹ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ 'ہاؤسنگ سوسائٹی' کے بارے میں پھر بھی فیصلہ نہیں ہوسکا یہ اُن کا ناولٹ ہے یا طویل مختصر افسانہ۔

ناول اور ناولٹ کے فرق کو سید وقار عظیم نے بہت خوبصورتی سے یوں بیان کیا ہے:

> ''ناول میں زندگی کا پھیلاؤ بھی ہوتا ہے اور گہرائی بھی اور اس لیے اس کی فنی ترتیب ویسی سیدھی سادھی اور ہموار نہیں ہوتی جیسی افسانے (مختصر یا طویل) کی چنانچہ ناوِلٹ بھی ناول کے مقابلے میں مختصر ہونے کے باوجود وسیع تر اور عمیق تر زندگی کا احاطہ بھی کرتا ہے اور فنی اعتبار سے اسی طرح کے اُتار چڑھاؤ میں سے گزرتا ہے۔'' [۵]

بہر حال قصہ مختصر یہ کہ قرۃ العین حیدر کے بعد اُردو میں زاہدہ حنا کا نام ہے۔ جنہوں نے پورے فنی شعور سے 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' کو ناولٹ کے طور پر پیش کیا ہے جب ہم اس ناولٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ٹریٹمنٹ بالکل ناولٹ کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔

تکنیکی اور فنی مہارت کا ایسا ثبوت ملتا ہے اور تکمیلیت کا ایسا احساس کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس ناولٹ میں موضوع کو گرفت میں لینے کے لیے بہت خوبصورتی سے نہ صرف یہ کہ انتہائی گٹھا ہوا پلاٹ بنا گیا ہے بلکہ کرداروں کی پیش کش اور واقعات کے تسلسل کو قائم رکھا گیا ہے۔ شروع سے آخر تک گرفت مضبوط رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایک واقعہ، کردار حتیٰ کہ کوئی مکالمہ تک غیر ضروری نظر نہیں آ تا۔ ہر عنصر ناولٹ کے تقاضوں کو بھرپور انداز سے نبھاتا ہے اس لیے زاہدہ حنا کے 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' کا شمار اُردو کے بہترین ناولٹس میں کیا جاتا ہے۔

۱۹۴۷ء کی تقسیم ہندوستان نے اس خطے کے لوگوں کو جس کرب اور دُکھ میں مُبتلا کیا تھا اور جو جو سانحات گزرے تھے وہ ہمارے بیشتر افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کا موضوع بنے کہیں انسانی بربریت کی عکاسی کی گئی کہیں جڑوں کی تلاش کا سوال اُٹھایا گیا اور کہیں انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ کو فوکس کیا گیا۔ زاہدہ حنا نے اس ناولٹ 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' میں اسی تقسیم کے پس منظر میں کچھ رشتوں کے ٹوٹنے اور کچھ نئے رشتوں کے بننے کو موضوع بنایا ہے جس میں زاہدہ حنا نے وقت کے ازلی اور ابدی کردار کو بھی شامل کر کے ناولٹ کو فلسفیانہ جہت عطا کی ہے۔

برجیس داور علی اپنے چچا کے گھرانے کو جو تقسیم کے وقت پٹنہ سے ہجرت کر کے کراچی آ جاتا ہے، تلاش کرتی ہوئی اکیلی ہندوستان سے پاکستان (کراچی) تک کا سفر کرتی ہے اور جب یہاں پہنچتی ہے تو اپنوں کو غائب پاتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک پارسی فیملی کے ہاں ٹھہرتی ہے اور یوں ناولٹ کا پلاٹ تشکیل پاتا ہے۔

برجیس کی ماں سوتیلی تھی جس کا برجیس کے ساتھ سلوک مناسب نہیں تھا اس لیے برجیس کا تعلق اپنے گھر سے باپ کی وجہ سے تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد برجیس کی جگہ گھر میں نہیں رہتی۔ اس سے پہلے ہی وہ پٹنہ سے لکھنؤ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جا چکی ہوتی ہے۔ تقسیم کے بعد اُسے اطلاع ملتی ہے کہ اس کے چچا اور چچازاد پرویز جس سے اُس کی شادی بچپن سے طے ہو چکی ہوتی ہے پاکستان ہجرت کر کے جانے کا ارادہ کر چکے ہیں اور پھر وہ چلے جاتے ہیں برجیس تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے گھر پٹنہ رہنے کی بجائے کراچی آنے کا فیصلہ کرتی ہے جہاں اس کے چچا اور پرویز ہیں، لیکن جب وہ یہاں پہنچتی ہے تو چچا کا پتہ نہیں ملتا ایسی صورت میں وہ کاؤس جی اور مسز کاؤس جی کے ہاں قیام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کاؤس جی اور مسز کاؤس جی اُسے بیٹی کی طرح

عزیز رکھتے ہیں کیونکہ ان کی بیٹی کچھ عرصہ قبل پسند کی شادی کرنے کے لیے گھر کو چھوڑ جاتی ہے اور یہ بات صرف کاؤس جی جانتے ہیں کہ وہ اب زندہ نہیں۔ کاؤس جی برجیس کے چچا اور پرویز کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے اور پھر ایک دن پرویز مل جاتا ہے۔ برجیس جب وہاں جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پرویز یہاں اپنے مالک کی بیٹی سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں اُسے مالی استحکام ملے گا یہ بات برجیس کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوتی ہے اور پاکستان میں اس کے رہنے کا جواز ختم کر دیتی ہے۔ کاؤس جی اور مسز کاؤس جی کی بے لوث محبت بھی اسے روک نہیں پاتی اور وہ واپس ہندوستان لوٹ جاتی ہے۔

ناولٹ میں تقسیم کے نتیجے میں غرض کی خاطر رشتوں سے بے اعتنائی کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ وقت بدلنے سے رشتہ اور حالات کیسے بدل جاتے ہیں اور حالات بدلنے سے بعض اوقات اپنے غیر اور غیر اپنے بن جاتے ہیں، لیکن اس تبدیلی سے بے نیاز وقت مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہ دیکھے بغیر کہ اُس کی بے نیازی لوگوں پر کس طرح سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ وقت کی اسی صفت کو زاہدہ حنا یوں بیان کرتی ہیں:

> ''یہ بات اُن کی سمجھ میں بہت دیر سے آئی کہ وقت سب سے بڑا ہے، لانہایت ہے ___ وقت بوڑھا نہ تھا اور نوخیز نوجوان بھی نہ تھا ___ وہ اندھا تھا، گونگا اور بہرا تھا اور سب کو روندتا ہوا گزرتا تھا ___ وقت کے بھی کئی درجے ہیں، کئی قسمیں ہیں۔ ایک وقت ہے جو ہمارے وجود سے ناواقف ہے۔ یہ انسانوں کو نوازتا ہے تب بھی نہیں جانتا اور جب برباد کرتا ہوا گزرتا ہے تب بھی اُسے معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی قومیں اُس کے قدموں تلے روندی گئیں کتنے قبیلے صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئے۔ لانہایت وقت، ہمیشہ سے موجود اور ہمیشہ موجود رہنے والا وقت اور ایک گھڑیوں اور تقویموں میں بٹھا ہوا وقت ہے۔ کینہ پرور، بٹ مار، دشمن، چھپ کر پیچھے سے وار کرنے والا۔'' [٦]

یہ ہے زاہدہ حنا کا بنیادی 'وقت' کا تصور جس پر پورے ناولٹ کا تار و پود بُنا گیا ہے کہتے ہیں کہ ہر ناول یا ناولٹ نگار کا ایک بنیادی نقطۂ نظر یا نظریۂ حیات ہوتا ہے جس کے گرد اس کی

تخلیقات گھومتی ہیں اگر نقطۂ نظر یا نظریۂ حیات واضح نہ ہو تو تخلیق مبہم ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نظریۂ حیات کیسے نشو و نما پاتا ہے؟ یہ تخلیق کار کے علم، تجربے اور مشاہدے سے تشکیل ہوتا ہے۔ ناول کے ممتاز نقاد ڈاکٹر ممتاز احمد خان بجا کہتے ہیں کہ

''کوئی بھی شخص جو کہانی کہہ رہا ہو ایک واضح نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ نقطۂ نظر اس کی نظر کی گہرائی vision کو ظاہر کرتا ہے۔ اس گہرائی کے پیچھے اس کا علم، تجربہ، مشاہدہ اور مطالعہ بول رہا ہوتا ہے۔'' [۷]

زاہدہ حنا کے تصورِ وقت کے پیچھے بھی ان کا تجربہ، علم، مشاہدہ اور وسیع مطالعہ کارفرما ہے۔ انہوں نے وقت کی ستم ظریفیوں کو دیکھا بھی ہے اور جھیلا بھی ہے۔ تصورِ وقت کے حوالے سے خواتین فکشن نگاروں پر نگاہ کی جائے تو قرۃ العین حیدر اور زاہدہ حنا ہی دو ایسے نام سامنے آتے ہیں جو نمایاں ہیں، لیکن قرۃ العین حیدر کے ہاں وقت کبھی کبھی مجرد شکل اختیار کر لیتا ہے جبکہ زاہدہ حنا وقت کے تصور کو زندگی میں سے الگ نہیں دکھاتیں۔ وقت ان کے کرداروں کی زندگی میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ گو وقت کی جبریت کا احساس حاوی رہتا ہے مگر یہ علیحدہ سے لاگو کیا ہوا محسوس نہیں ہوتا، وقت ہمیں کہاں لے جاتا ہے اور کیسے لے جاتا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔

''پٹنہ سٹی سے ٹرین جب روانہ ہوئی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو رہی ہے جس میں منزل پر پہنچ کر بھی وہ منزل پر نہیں پہنچے گی۔'' [۸]

کیا اپنی زمین سے اُکھڑے ہوئے لوگوں کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے؟ کیا اپنی مٹی کو چھوڑ کر جانے والوں کو کبھی چین ملتا ہے؟ تقسیم کے بعد وقت نے کئی افراد سے صرف اسی لیے انتقام لیا کہ وہ اپنی زمین سے اکھڑ گئے تھے۔ حالات ان کے موافق نہیں رہے تھے۔ برجیس شعوری اور نظری طور پر ہجرت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''برجیس نے اپنی زمین کے سوا کسی دوسری زمین پر رہنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بٹوارہ ہوا تھا اور بے شمار لوگوں نے رخت سفر باندھا تھا، لیکن ابا میاں نے ہر جانے والے کو یہی کہہ کر رُخصت کیا تھا کہ میاں مٹی ماں کی طرح ہوتی ہے۔ ہم اس کے خمیر سے جنم لیتے ہیں اور سکھ کی نیند بھی اسی

میں سوتے ہیں۔ ماں کو چھوڑ کر جاؤ گے تو کبھی چین نہیں پاؤ گے۔'' [۹]

لیکن برجیس کے نہ ابا میاں رہے اور نہ ہی گھر رہا اور وہ پرویز جس سے ''اُس کی نسبت پیدائش کے لمحے سے ہی ___ طے تھی'' [۱۰] اور جس سے برجیس کا بے پناہ دلی تعلق تھا اور اس کی یاد برجیس کے ''دل سے جدا ہی نہیں ہوئی تھی۔'' [۱۱] وہ پرویز سوچ کر کہ ''اب مسلمان نوجوانوں کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں رہی'' کراچی جا چکا تھا۔ برجیس کے لیے اب کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ بے بسی کے عالم میں حالات کے دھارے پر بہہ نکلتی ہے اور نتیجتاً وقت کے ظالم ہاتھوں کا شکار بنتی ہے، لیکن اس کے ذہن میں، سوالات اُٹھتے رہتے ہیں جو اس کے لیے اذیت کا باعث ہیں۔

''ہر سانس اذیت تھی، ہر لمحہ عذاب تھا۔ اپنی زمین کیا صرف اس لیے ترک کر دی جائے کہ پرویز نے اس زمین کو چھوڑ دیا تھا، یا اس لیے کہ چھوٹی امی کو اُس سے نفرت تھی۔'' [۱۲]

جن لوگوں نے ذاتی مفاد کے لیے ہجرت کی وہ یہاں آ کر خوش حال ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ خود غرض بھی پرویز ایسے ہی باشندوں کا نمائندہ ہے جبکہ برجیس اُن لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے جو کسی لالچ یا غرض کو پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ اپنے باپ کی جائیداد کا کوئی کاغذ یا پتر ساتھ نہیں لاتی۔ پاکستان میں دور کے چچا حسنو اور ذہین چچی مل جاتے ہیں اور وہ جب کاغذات کے سلسلے میں استفسار کرتے ہیں اور یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ تو جھوٹے کلیموں سے زمین اور مکان لے رہے ہیں تم بھی کوئی جھوٹا ہی سہی کاغذ تو جمع کراؤ تو برجیس یہ کہہ کر انہیں چپ کروا دیتی ہے کہ

''میں نہ کسی جائیداد کے کاغذات لائی ہوں۔ نہ میرا کلیم کا ارادہ ہے۔ اشرف چچا مل جائیں اور ذہن یکسو ہو جائے تو میں کسی کالج میں ملازمت کر لوں گی۔ میں زندگی دوسروں کے سر گزارنے کی قائل نہیں۔'' [۱۳]

کاؤس جی اور مسز کاؤس جی کے پارسی گھرانے کے ذریعے مصنفہ نے یہ دکھایا ہے کہ بعض اوقات مذہب اور کلچر کی دُوری کے باوجود دو انسان مشترک دُکھ اور درد کی بنیاد پر ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ کاؤس جی کی بیٹی 'مینو' اپنے والدین کو اپنی جدائی کا دُکھ دے گئی

تھی۔انہیں برجیس میں اپنی بیٹی مینونظر آئی اور وہ دونوں میاں بیوی اسے سچ مچ اپنی بیٹی سمجھنے لگے جبکہ برجیس کو کاؤس جی کی شکل میں ابامیاں مل گئے۔

> ''کاؤس جی ہوا میں تحلیل ہوئے۔ابا میاں کی دو مہربان آنکھوں نے سنہری فریم کے چشمے کے پیچھے سے اُسے دیکھا اور اُس کی طرف ایک کاغذ بڑھایا۔''[۱۴]

وہ ابا میاں جو اس کے ناز اُٹھاتے اور برجیس کے دل کی ہر حالت کو سمجھتے تھے وہ ابا میاں ''جنھوں نے اُسے اتنی محبت دی تھی، اس قدر چاہا تھا کہ ماں کی ضرورت اُسے کبھی محسوس بھی نہیں ہوئی تھی۔''[۱۵] اور مسز کاؤس جی کی صورت میں وہ ماں جس کی شکل اُس نے کبھی نہیں دیکھی تھی لہٰذا اُن کے مشترک دُکھ اُنہیں ایک ایسے رشتے میں پرو دیتے ہیں جو بہت گہرا اور بہت بڑا ہے۔اسی لیے جب برجیس مایوس ہو کر کراچی سے واپس ہندوستان جانے لگتی ہے اور مسز کاؤس جی انتہائی دُکھ سے کہتی ہیں کہ ''اپُن سے تمہارا کیا رشتہ''[۱۶] تو برجیس جواب دیتی ہے کہ ''آپ کا اور میرا رشتہ ہر رشتے سے بڑا ہے''[۱۷] اور یہ سچ ہے کہ اس دنیا میں دُکھ کا رشتہ ہی سب سے بڑا اور گہرا رشتہ ہے۔

پارسی فیملی کو زاہدہ حنا نے اس ناولٹ میں موضوع بنا کر (اگر چہ بنیادی موضوع نہیں مگر موضوع کا لازمی حصہ بنا کر) پاکستان میں موجود اقلیتوں کے دُکھ اور اُن کی مٹتی ہوئی روایات کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

سندھ کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ علاقہ مختلف تہذیبوں کا مسکن رہا ہے۔ یہ سب تہذیبیں جداگانہ تشخص رکھنے کے باوجود سندھ کے وسیع تر تہذیبی منظرنامے کا حصہ رہی ہیں۔ اِن میں سے پارسی تہذیب وثقافت کا رنگ و آہنگ بہت نمایاں رہا ہے۔اِس تہذیب کی سندھ میں اہمیت کے حوالے سے سید مظہر جمیل لکھتے ہیں:

> ''اِس شہر کی تعمیر و تہذیب میں پارسیوں کا حصہ دوسرے تہذیبی عناصر سے کہیں زیادہ نمایاں اور اہم ہے۔جس کے شواہد اب بھی قدم قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔جمشید نسروانجی (۱۸۸۶-۱۹۵۲ء) کو بجا طور پر جدید کراچی کا معمار کہا گیا ہے۔''[۱۸]

قیامِ پاکستان سے قبل کراچی میں پارسیوں کی خاصی آبادی مقیم تھی اور شہر کی زندگی میں ان کے رسم و رواج، رہن سہن، طور طریقوں اور طرزِ احساس کا نمایاں طور پر رنگ نظر آتا تھا، لیکن تقسیم کے بعد رفتہ رفتہ پارسیوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ یوں اُن کے ثقافتی آثار بھی دھندلے اور بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ پارسی عقیدے میں انسان دوستی کا عنصر بہت زیادہ ملتا ہے۔ سید مظہر جمیل اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہندوستان و پاکستان میں پارسیوں کی تہذیب دراصل زرتشتی اور ایرانی ثقافت و تہذیب کی توسیع رہی ہے، مگر مقامی و گجراتی آمیزش کے ساتھ، یوں بھی پارسی تمدن میں دوسرے مقامی تہذیبی مظاہر سے متصادم ہونے کی بجائے اُن کے ساتھ پیوست ہو کر چلنے کی انسان دوست اور صلح کُل روش موجود رہی ہے۔'' [۱۹]

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے اہم اور انسان دوست تہذیبی مظہر پر اُردو فکشن میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی، لیکن زاہدہ حنا نے پہلی دفعہ اِس معدوم ہوتی تہذیب و ثقافت کو اپنے ناولٹ کا موضوع بنایا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے فاطمہ حسن امریکہ گئیں تو ان کی ملاقات بپسی سدھوا اور احمد مشتاق سے ہوئی اور زاہدہ حنا کے ناولٹ کا ذکر بھی ہوا۔ بپسی سدھوا پارسی کمیونٹی پر لکھے گئے انگریزی ناول "The Crow Eater" کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔ اُنہوں نے زاہدہ حنا کے اس ناولٹ کا ذکر دلچسپی سے سُنا۔ فاطمہ حسن اس ضمن میں لکھتی ہیں کہ

''زاہدہ حنا کے ناولٹ 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' کا ذکر بپسی سدھوا اور احمد مشتاق نے دلچسپی سے سُنا کہ کراچی کی پارسی کمیونٹی کو اس کی روایات کے ساتھ بہت خوبصورتی سے زاہدہ حنا نے موضوع بنایا ہے۔'' [۲۰]

اس میں شک نہیں کہ زاہدہ حنا نے اس ناولٹ میں پارسی کمیونٹی کو اس کی روایات کے ساتھ نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اُن کا رکھ رکھاؤ، آداب، تہذیب، انسانیت غرض یہ کہ پورا ثقافتی رچاؤ اوراق پر سمیٹ دیا ہے۔ اس حوالے سے عذرا لیاقت لکھتی ہیں:

''زاہدہ حنا نے پہلی مرتبہ باقاعدہ اور منظم طریقے سے معدوم ہوتی پارسی

تہذیب وتمدن، اُن کے رہن سہن، رسوم و رواج، طور طریقوں اور طرزِ احساس کو بہت موثر اور جامع انداز میں ہجرت کے آشوب سے ہم آہنگ کر کے اپنے اس ناولٹ (نہ جنوں رہا، نہ پری رہی) میں پیش کیا ہے۔ پارسیوں کے طرزِ زیست کی موثر منظر کشی کی وجہ سے اس حزنیہ فضا میں جنم لینے والی کہانی نے امتیازی مقام حاصل کرلیا ہے۔'' [۲۱]

زاہدہ حنا کا تاریخ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ اُن کی کہانیوں، کالم اور تحریروں میں اسی تاریخی شعور کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس ناولٹ میں بھی ایسے کئی مقامات آئے جہاں ان کے وسیع مطالعے کا احساس ہوتا ہے۔ اسی تاریخی شعور کی وجہ سے وہ یہ کہنے کی ہمت کرسکیں کہ

'' کاؤس جی اور مسز کاؤس جی اور اُن کے ہم قوم جو آج ایک مرتی ہوئی نسل سے ہیں کل اُن کا کیا کروفر تھا۔ ان کے لکڑ دادا اور سکڑ دادیاں منتخب روزگار۔ یہ اُن ہی کا کنجر وتھا جس کے بحری جہازوں کو طوفان نے ڈبو دیا تھا تو اُس نے سمندر کو دُرے مارے تھے، زنجیریں پہنائی تھیں، قید کیا تھا، لیکن جب وقت نے ان کی طرف سے پیٹھ پھیری تو دراز داڑھیوں والے اونٹنی کا دودھ پینے اور سوسمار کھانے والے عرب گھوڑے دوڑاتے تلواریں لہراتے ان پر ٹوٹ پڑے، اُن کے آتش کدے بجھائے گئے، اُن کی کتابیں جلائی گئیں اُن کے بزرگوں میں سے بے شمار قتل ہوئے اور بے شمار نے موت کے سائے میں اپنے مذہب سے کنارہ کیا۔ بچ رہنے والوں میں سے مٹھی بھر وہ بھی تھے جنہوں نے ہندوستانی دارالامان کا رُخ کیا۔'' [۲۲]

زاہدہ حنا کو زرتشت مذہب اور اس کے عقائد سے بھی والہانہ لگاؤ ہے اور اس کا اظہار ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ اپنے ناولٹ میں زاہدہ حنا نے اس عقیدے کی ختم ہوتی نسل اور ان کے مذہبی رسوم ورواج کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ زاہدہ حنا کسی موضوع کو بیان کرنے کے لیے پوری تحقیق اور مطالعہ کرتی ہیں اور پھر اس کو تخلیقی عمل کا حصہ بنا کر احاطۂ تحریر میں لاتی ہیں۔ دینِ زرتشت کے متعلق تاریخی اور مذہبی معلومات زاہدہ حنا کے علاوہ کسی دوسرے اُردو ادیب کے

ہاں اتنی تفصیل سے نہیں ملتیں۔ زرتشت مذہب میں مردے کو دفنایا یا جلایا نہیں جاتا بلکہ کسی بلند مقام پر جانوروں کی خوراک بننے کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی لکھتے ہیں:

''پرستش کے لائق آہورامزدا ہے آگ آہورامزدا کا ایک مادی نشان ہے۔ اس لیے یہ ایک مقدس چیز ہے۔ زمین اور پانی بھی مقدس ہیں۔ پانی کو گدلا اور زمین کو ناپاک کرنا گناہ ہے۔ چنانچہ جب کوئی آتش پرست مرجاتا ہے تو اس کو زمین میں دفن نہیں کیا جاتا بلکہ جانوروں کی خوراک بننے کے لیے اسے کسی بلند مقام پر ڈال دیا جاتا ہے جسے دخمہ کہا جاتا ہے۔'' [۲۳]

'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' میں زاہدہ حنا نے مسز کاؤس جی کی آخری رسومات کی منظر کشی اس طرح کی ہے:

''دخمہ اب سامنے تھا، ممی پتھر کے چبوترے پر رکھی گئی آخری سگ دید ہوئی پھر ان کا چہرہ ڈھک دیا گیا منوچہر کے سینے میں درد نے کروٹ لی۔ یہ صورت اب کبھی نظر نہیں آئے گی نسی سالار انہیں پھر سے لے کر چلے دخمے کا دروازہ کھلا اب وہ لوہے کی سلاخوں پر آرام کریں گی۔'' [۲۴]

زاہدہ حنا نے تقسیم کے المیے کا ایک رُخ عوامی نفرت کا چہرہ اُٹھا کر بھی واضح کیا ہے۔ تقسیم نے دونوں طرف کے عوام کے دلوں میں مذہبی اور فرقہ ورانہ نفرت کا جو زہر بویا تھا اور جن تعصّبات کو ہوا دی تھی وہ کینسر بن کر تیزی سے پھیل رہے تھے اور اسی کی وجہ سے نئے بننے والے دونوں ممالک میں ہزاروں افراد کو بے رحمی اور بے دردی سے مذہب کی آڑ میں قتل کیا جارہا تھا۔ کراچی شہر میں بر جیس دیواروں پر جو نعرے پڑھتی ہے وہ عوامی نفسیات کا بھرپور اظہار یہ ہیں:

''دیواروں پہ کوڑھ پھوٹا ہوا تھا، شہید بابری مسجد کی پکار، ریپ انڈیا، نعرۂ سندھو، جئے سندھو، شیعہ کافر، جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حق دار ہے۔ قادیانی واجب القتل ہیں ماریں گے مر جائیں گے، مہاجر صوبہ بنائیں گے، کرش انڈیا، نعروں کا تعاقب یہاں بھی جاری تھا۔'' [۲۵]

برجیس اور پارسی فیملی کے تعلق سے تقسیم کی پیدا کی گئی مذہبی، نسلی، علاقائی، لسانی اور جغرافیائی نفرتوں کی بھی نفی کی گئی ہے۔ زاہدہ حنا نے اس رشتے سے انسانیت کے رشتے کی تلاش کی ہے جسے اس خطے کے لوگ یا تو بھلا چکے ہیں یا اندر کہیں دَبا چکے ہیں۔ برسوں بعد جب برجیس ایک بار پھر کراچی مسز کاؤس جی سے ملنے آتی ہے۔ اسی دوران اُن کا انتقال ہوتا ہے۔ اُن کا بیٹا منوچہر، برجیس سے پوچھتا ہے کہ 'صدیوں بعد کیوں آئیں؟' تو جواباً برجیس کہتی ہے:

> ''میرے لیے کائنات میں تمہارا گھر آخری سچ تھا اس گھر کے لوگوں نے مجھ سے خون کا، دودھ کا، ٹھیکرے کی مانگ، مذہب اور زبان کا حوالہ نہیں مانگا۔ میں ایک سہمی ہوئی لڑکی تھی اور اس گھر نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ میں سچ کی اس چوکھٹ پر ماتھا ٹیکنے آئی تھی۔'' [۲۶]

ناولٹ کا موضوع حقیقت کے قریب تر ہے۔ اس کا دورانیہ تقسیم اور تقسیم کے ابتدائی چند سالوں پر محیط ہے جس میں بننے والی فضا اور پیدا ہونے والے حقائق اس ناولٹ میں سمیٹ دیئے گئے ہیں پھر یہ کہ اس تقسیم نے انسانی جذبات اور نفسیات میں کیا کیا اتھل پتھل کی اور کن کن جذباتی صدموں اور نفسیاتی عارضوں کو انسان کا مقدر بنایا ان کا موثر بیان رقم ہو گیا ہے۔ تقسیم اس خطے کی وہ ٹریجڈی ہے جس کا مکمل احاطہ تو شاید کبھی نہ ہو سکے مگر زاہدہ حنا جیسے چند فنکاروں نے اُس ٹریجڈی کے کچھ پہلو نہ صرف یہ کہ اُجاگر کیے بلکہ اُنہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ قرطاس پر لکھ کر محفوظ بھی کر لیا۔ اس ناولٹ کی یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس ٹریجڈی کو بیان کرنے کے لیے زاہدہ حنا نے کچھ مخصوص کردار لیے ہیں۔ کردار کسی ناول یا ناولٹ کے موضوع کو نبھانے کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں۔ ناول یا ناولٹ میں قصہ، کہانی یا عمل کی پاسداری کرداروں کے ذریعے ہی ممکن ہے بلکہ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ ناول کرداروں کی مصوری کا نام ہے۔ مثلاً معروف ناول نگار پریم چند کہتے ہیں کہ

> ''میں ناول کو کردار کی مصوری سمجھتا ہوں، انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اُس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔'' [۲۷]

کرداروں کے متعلق ایک تصور یہ ہے کہ کرداروں کو ناول نگار نہیں بلکہ قاری جنم دیتا ہے۔ مغربی نقاد رابرٹ لڈل (Robert Liddel) لکھتا ہے کہ

"Character is the creation of the reader, not of the novelist."[۲۸]

اصل میں لڈل یہ کہنا چاہتا ہے کہ کردار وہ ہوتے ہیں اور ویسے ہوتے ہیں جیسے قاری اپنے ذہن میں تشکیل دیتا ہے۔ اس تصور کا ایک اور مطلب بھی سکتا ہے اور وہ یہ کہ ناول نگار، قاری کو سامنے رکھ کر کرداروں کی تشکیل کرتا ہے تا کہ وہ اُنہیں بآسانی قبول کر لے بہر حال یہ طے ہے کہ کردار ہی کہانی یا قصے کے وسیلے کا موثر سبب ہیں۔

زاہدہ حنا نے اپنے اس ناولٹ میں کرداروں کو خود تشکیل دیا ہے۔ ہم یہاں رابرٹ لڈل کا فارمولا استعمال نہیں کر سکتے۔ زاہدہ حنا نے اپنے کرداروں کو نہایت سمجھ داری اور فن کاری سے تخلیق کیا ہے۔ ان کے کردار ناولٹ کے بیانیہ کی تشکیل کرتے ہیں اور ناولٹ کا بیانیہ کرداروں کی مصوری کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ ناول میں کردار نگاری کے کچھ معیار مقرر ہیں جنہیں میلان کنڈیرا نے بہت تفصیل سے یوں بیان کیا ہے:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ دو صدیوں کی نفسیاتی حقیقت پسندی نے واقعی چند نا قابلِ حرمت معیار کھڑے کر دیے ہیں (۱) لکھنے والے کو کردار کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنی چاہئیں (۲) اسے کردار کے ماضی سے قاری کو باخبر کرنا چاہیے کیونکہ اُس کے حاضرہ طرزِ عمل کے سارے محرکات وہیں موجود ہوتے ہیں (۳) کردار کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے، جس کا مطلب ہے کہ لکھنے والے کو خود اپنے تمام ملاحظات سمیت غائب ہو جانا چاہیے تا کہ قاری کی سوچ میں مخل نہ ہو جو التباس کا جویا ہے اور فکشن کو حقیقت سمجھنا چاہتا ہے۔'' [۲۹]

کہانی کا تانا بانا جن کرداروں سے بُنا گیا ہے۔ ان میں 'برجیس' مرکزی کردار ہے۔ اس کے ساتھ کا ڈس جی اور مسز کا ڈس جی کے کردار ہیں جو کسی طور کم اہمیت کے حامل کردار نہیں۔ پرویز کا کردار ایسا ہے کہ جس کے بغیر کہانی چل ہی نہیں سکتی۔ ان کے علاوہ 'منوچہر' زبین چچی، حُسنو چچا، قمر بھائی، شمع اور ثریا ضمنی کردار ہونے کے باوجود دلچسپ بھی ہیں اور ناولٹ کے بیانیہ کی تکمیل کے لیے ضروری بھی۔ زاہدہ حنا کی خوبی یہ ہے کہ ناولٹ میں جس کردار کی جتنی گنجائش ہے وہ کردار

اتنی ہی space لیتا ہے۔اس سے نہ ذرا زیادہ نہ کم۔ یہ چیز قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ اگرچہ قرۃ العین حیدر کے ناولٹ فنی اعتبار سے بہت مضبوط ہیں۔مگر کرداروں کی ناولٹ میں گنجائش کے مطابق سمائی اتنی مہارت کے ساتھ شاید وہاں بھی نہ ملے۔

'برجیس' زاہدہ حنا کا نہایت اہم نسوانی کردار ہے۔اس میں متانت بھی ہے، ذہانت بھی ہے، شخصیت کا وقار اور شان بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وفا بھی ہے اور وضع داریوں کا پاس بھی ہے۔ برجیس کے کردار کی وضاحت اُس مکالمے سے ہوتی ہے جو شمع کے ساتھ (جو دور پار کی چچی زبین کی بیٹی ہے) ادا ہوتا ہے۔

> ''بزرگوں کا احترام ہم پر لازم ہے اور جہاں تک زندگی کے بارے میں فیصلے کرنے کا مسئلہ ہے تو اب یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ ہم زندگی کس ڈھب سے گزاریں، ان کی کون سی بات مانیں اور کون سی رد کریں۔ آپ کی ان ہی باتوں پر تو میں منہ تکتی ہوں آپ کا۔ یوں بولتی ہیں جیسے کوئی مرد بول رہا ہو۔ ہمارے تو بھائی جان بھی اس طرح باتیں نہیں کرتے۔'' [۳۰]

برجیس ایک کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے گھرانے کی لڑکی ہے۔اپنے حقوق کے متعلق بات کرنا اور سلیقے سے بات کرنا جانتی ہے۔اس لیے شمع کو اس پر 'مرد' ہونے کا شائبہ ہے۔ برجیس ایک باشعور کردار ہے جو روایتوں کی لکیر کو نہیں پیٹ سکتا، لیکن روایتوں کا یکسر رد بھی اس کی طبیعت کا حصہ نہیں۔اس کے رویے میں اعتدال ہے، توازن ہے رکھ رکھاؤ ہے، سلجھاؤ ہے، وہ دنیا کی اوڑھائی ہوئی سوچ اور سکھائی ہوئی زبان نہیں بول سکتی۔ وہ کہتی ہے:

> ''لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں اور کیا نہیں کر رہے۔ یہ میرا مسئلہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ہمیں خود کیا زیب دیتا ہے اور کیا بات ہمارے لیے نامناسب ہے، یہ ایک بالکل، دوسری بات ہے۔'' [۳۱]

اسی لیے شمع کہتی ہے کہ

> ''برجیس باجی!____ بھائی جان آپ کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ بہت مرغوب ہیں وہ آپ سے لیکن شاید یہ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ ایک مختلف چیز

ہیں۔ آپ اُن ایسے عام مردوں کے لیے نہیں بنیں۔'' [۳۲]

برجیس واقعی عام مردوں کے لیے نہیں بنی تھی اور پرویز بھی عام آدمی ہی ثابت ہوا تھا لہٰذا برجیس اور پرویز کا ملاپ ممکن ہی نہیں تھا۔ پرویز وہ کردار ہے جس کی کشش اور محبت برجیس کو پاکستان کھینچ لاتی ہے۔ برجیس کی بات اپنی جگہ سچ کہ ''ابا میاں اگر زندہ ہوتے تو میرے گھر چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا'' [۳۳] لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ابا میاں کے نہ ہونے کے بعد برجیس نے گھر صرف پرویز کے لیے چھوڑا۔ وہ پرویز جس نے ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت برجیس سے مشورہ کرنا یا ملنا بھی ضروری خیال نہیں کیا تھا اور کراچی پہنچ کر اپنی ہجرت کی اطلاع دی تھی اور اب اپنی زندگی میں گم بلکہ غرق ہو گیا تھا۔ برجیس پرویز کو یاد کر کے سوچتی ہے کہ

''یار پرویز، تم اس قدر کانٹے کے دوست تھے کانٹے کے دوستوں کو زندگی کے روزمرہ میں اس طور تو غرق نہیں ہونا چاہیے کہ دوستیاں، محبتیں، چاہتیں، لڑائیاں، میلاپ کچھ بھی یاد نہ رہے۔'' [۳۴]

پرویز واقعی کانٹے کا دوست تھا۔ برجیس سے محبت کرتا تھا، مگر برجیس کی نسوانی حیثیت کو ہضم کرنا اُس کے لیے مشکل ہو گیا۔ دوسری طرف نئے ملک میں ٹھاٹ سے رہنے کی قیمت چکانے اور کاروبار بڑھانے کی غرض بھی غالب آ گئی۔ سو پرویز برجیس سے اپنا راستہ الگ کر لیتا ہے۔ پرویز جو برجیس کا سب کچھ تھا اب اجنبی ہو گیا تھا۔

''برجیس نے شام کی سرمئی روشنی میں پرویز کو دیکھا، وہ آشنا چہرہ جسے اُس نے بچپن سے دیکھا تھا جس کا ایک ایک نقش اُس کے ذہن پر رقم تھا جس کی ایک جھلک اس کے لہو میں مصری گھول دیتی تھی۔ آسائش کا احساس بچھاتی تھی وہی چہرہ آج کس قدر اجنبی، کتنا غیر تھا۔'' [۳۵]

پرویز کے سامنے اب شاندار مستقبل تھا۔ جمشید صاحب کی بیٹی سے اس کی نسبت ٹھہر چکی تھی جس کے عوض آدھا کاروبار پرویز کے نام ہونے والا تھا۔ وہ اس کامیابی اور شاندار مستقبل کے لیے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار تھا۔ رشتوں، ناتوں کو داؤ پر لگا سکتا تھا۔ برجیس سوچتی ہے ''رشتے کیا اِسی طور بیچ منجدھار میں چھوڑے جاتے ہیں؟ ہجرت کیا واقعی انسانوں کا خون سفید کر دیتی ہے۔'' [۳۶] پرویز اور اشرف چچا کا خون واقعی سفید ہو گیا تھا اسی لیے تو نٹ کھٹ پرویز کے لہجے

میں اس قدر سفا کی اُتر آئی تھی اسی وجہ سے وہ ایسے الفاظ اتنی آسانی سے ادا کر جاتا ہے۔

''بات دراصل یہ ہے برجیس کہ ہم دونوں کی نسبت ہمارے بزرگوں کا چونچلا تھی اور انہی کے ساتھ ختم ہوئی تمہارے مزاج میں خودسری بہت ہے۔تم جو درست سمجھتی ہو وہ کر گزرتی ہو مجھے اس وضع کی لڑکیاں پسند نہیں ___ میرے اور تمہارے راستے بہت پہلے ہی الگ ہو گئے تھے۔ میں اسی لیے یہاں چلا آیا تھا کہ میرے خیال سے یہاں میرے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے جب کہ وہاں میں عمر بھر کلرکی کرتا رہتا۔میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ تم یہاں چلی آؤ گی اگر اس کا مجھے شائبہ بھی گزرتا تو میں بلا کم وکاست ہر بات لکھ دیتا۔'' [۳۷]

کاؤس جی اور مسز کاؤس جی (بانو آنٹی) اس عہد میں کہ جہاں سب رشتے، تعلق اور محبتیں جل رہے تھے۔انسانی محبتوں کا مینارۂ نور بن کر سامنے آتے ہیں جن کے گھر برجیس اتفاقاً پناہ لینے پر مجبور ہوتی ہے اور پھر وہی گھر اُس کا آخری سہارا بن جاتا ہے۔کاؤس جی مذہباً پارسی اور پیشہ کے اعتبار سے وکیل ہیں اُن کی پدرانہ شفقت برجیس سے اپنائیت کا رشتہ قائم کر لیتی ہے۔ برجیس جب پہلی رات کاؤس جی کے گھر گزار کر اگلی صبح یہ سوچ کر کہ ''میں ان لوگوں پر بوجھ نہ بن جاؤں'' خاموشی سے گھر سے نکلنے لگتی ہے اور کاؤس جی عین وقت پر اُسے روک لیتے ہیں تو اُن کی ڈانٹ میں اپنائیت کا رس اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ

''تم نوجوان، انسانوں کے بارے میں کس قدر غلط اندازے لگاتے ہو کیسے کیسے اقدام کر گزرتے ہو۔تمہارے خیال میں رات گزر گئی تھی چنانچہ تم ہمارے لیے ایک بہت بڑا بوجھ بن گئی تھیں۔شکر ادا کرو کہ میں جاگ رہا تھا۔لازم نہیں کہ تم ایک اجنبی شہر میں تنہا نکلو تو دوسری مرتبہ بھی کوئی ایسا ہی گھر تمہیں مل جائے۔برجیس سر جھکائے بیٹھی رہی۔اگر وہ اسے احسان فراموش کہتے خودغرض گردانتے تو اُن کا سامنا کرنا کتنا آسان ہوتا، لیکن وہ تو ابا میاں کی طرح ڈانٹ رہے تھے۔'' [۳۸]

اور یہی وہ شفقت ہے جو ناولٹ کے اخیر تک قائم ودائم رہتی ہے۔پہلے بھی ذکر ہوا کہ

کاؤس جی اور مسز کاؤس جی کے کرداروں سے زاہدہ حنا نے اس ناولٹ کو معنوی وسعت سے ہمکنار کیا ہے یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول کا کینوس خواہ سو، سوا سو یا ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے افسانے سے کہیں زیادہ فکری پھیلاؤ رکھتا ہے۔'' [۳۹] بالکل درست ہے اور اس کا ثبوت اس ناولٹ میں اِن دو کرداروں یا اس پارسی فیملی کی پیش کش سے ملتا ہے۔

مسز کاؤس جی (بانو آنٹی) مادرانہ شفقت کی ایک اہم مثال ہے۔ اُردو فکشن میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اپنی بیٹی اور بیٹے سے ایسی محبت ہے کہ اس محبت کے پھیلاؤ میں سب آ جاتے ہیں۔ دُکھ سے بھری ہوئی 'بانو آنٹی' جن کی ہنسی میں آنسوؤں کا نمک رچ گیا تھا۔

> ''انہوں نے (بانو آنٹی نے) ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس ہنسی میں آنسوؤں کا نمک رَچا ہوا تھا اس ہنسی کی اسے (برجیس کو) بہت گہری پہچان تھی۔'' [۴۰]

اور بانو آنٹی کے دُکھ کی وجہ اُن کی بیٹی مینو کی جدائی تھی۔ ماں اپنی اولاد سے کس قدر محبت کرتی اور جدائی میں کتنا تڑپتی ہے اس کو زاہدہ حنا نے فنکارانہ انداز سے یوں بیان کیا ہے کہ

> ''ماں کا عذاب دل کی زمین میں شاید باپ کی اذیت سے کئی میل زیادہ گہرائی میں اُترا ہوا تھا تب ہی ہنسی پر آنسوؤں کی نمی پھیل جاتی تھی۔'' [۴۱]

زاہدہ حنا نے اپنے ناولٹ 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' میں کرداروں کے حسبِ حال زبان استعمال کی ہے۔ مسز کاؤس جی کی زبان مسز کاؤس جی کی ہی ہو سکتی تھی۔ نمونہ دیکھئے:

> ''ابھی تم کائے کو سرڈالے بیٹھا ہے۔ تھوڑی دیر مغز کو آرام دیو وری نئیں کرو۔ ہمارا ایڈووکیٹ جنرل تمہار ریلیٹو کو ڈیٹکٹو مافک نکال لائیں گا۔'' [۴۲]

اسی طرح ایک کردار باورچی کا ہے جو پرویز کے گھر ملازم ہے۔ صادق باورچی جو پورب کا ہے اور اب کراچی میں ہے۔ ثریا (پرویز کی بہن) جب برجیس کا اُس سے تعارف یہ کہہ کر کراتی ہے کہ یہ کھانے پکانے کا بقول خود ماشٹر ہے تو صادق کہتا ہے:

> ''ارے بی بی اب کہاں ماشٹری رہی ___ اپنی طرف تھے تو واکئی ماشٹر

تھے یہاں تو ہجار مسالے ملیں ہی ناہیں ___ ارے جائقہ کوئی سُسرے
صادق کی کفگیر میں تھوڑی ہے کہ کفگیر گھمایا تو جادو سے جائقہ اگ آئے
کھانے میں۔ جائفل جوتری ڈھونڈنے جاؤ پنساری کی دُکان پر، لو ہم
سُسرا مسالہ ڈھونڈت ہیں، کسی بیماری کا نسخہ تھوڑی مانگت ہیں۔'' [۴۳]

ناولٹ کی تکنیک 'بظاہر سادہ بیانیہ پر مشتمل ہے مگر اس میں فلیش بیک کی تکنیک کو جس انداز سے ضم کر کے برتا گیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ تکنیک کے متعلق ممتاز شیریں لکھتی ہیں کہ

''تکنیک کی صحیح تعریف ذرا مشکل ہے۔ مواد، اُسلوب اور ہیئت سے ایک
علاحدہ صنف، فن کار مواد کو اُسلوب سے ہم آہنگ کر کے اُسے ایک
مخصوص طریقے سے متشکل کرتا ہے۔ افسانے کی تعمیر میں جس طریقے
سے مواد ڈھلتا جاتا ہے وہ ہی تکنیک ہے۔'' [۴۴]

یعنی 'تکنیک' وہ طریقہ ہے جس کو بروئے کار لا کر ناولٹ یا ناول کی ہیئت کی تشکیل کی جاتی ہے۔ زاہدہ حنا کے اس ناولٹ میں بیانیہ کے ساتھ فلیش بیک کی تکنیک ناولٹ کی ہیئت کو تشکیل دیتی ہے۔ برجیس کا ماضی اس کے حال کے ساتھ ساتھ رواں رہتا ہے۔ یہ نہ صرف ناولٹ کی کہانی کو آگے بڑھانے کے کام آتا ہے بلکہ ان لوگوں کے المیہ کو بھی سامنے لاتا ہے جو اپنی زمین اور ماضی سے کاٹ دیے گئے مگر ماضی ان کے ذہنوں سے مٹ نہ سکا۔ وہ جسمانی طور پر حال میں اور ذہنی طور پر ماضی مین جاگزیں رہے۔ فلیش بیک کی تکنیک نے ایسے کرداروں کے ماضی کو حال سے استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ زاہدہ حنا ماضی کو حال میں زندہ رکھنے کے لیے یہ تکنیک استعمال کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ 'خود کلامی' کی تکنیک بھی کہیں کہیں موثر طور پر اپنی جھلک دکھلاتی ہے جس سے ناولٹ کا بیانیہ مزید تقویت حاصل کرتا ہے۔ ایک شام کاوَس جی اور مسز کاوَس جی برجیس کو سمندر کنارے تفریح کے لیے لے جاتے ہیں تو برجیس کو پرویز کا خیال آتا ہے وہاں خود کلامی، بیانیہ میں آمیز ہو کر جذبات کی شدت کو جس طرح اُجاگر کرتی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''پرویز، ثریا اور اشرف چچا سب ہی یہاں آئے ہوں گے۔ کراچی میں
رہتے ہوئے ان لوگوں کو اتنے دن ہو گئے، کم از کم ایک دو بار تو ضرور ہی

سمندر کی سیر کی ہوگی۔ پرویز کے پیروں کی دُھول جانے ریت کے اربوں، کھربوں ذروں کے درمیان کہاں ہے؟ پھر اپنے خیال پر برجیس کو خود ہی ہنسی آ گئی۔ یہ اس قدر دیوداسیوں اور پتی ورتا بیویوں والا خیال نہایت مضحکہ خیز تھا مانا کہ ہمیں تم سے بہت محبت ہے لیکن تمہارا سانس کی طرح جاری ساری رہنا نہ کبھی مجھے محسوس ہوا اور نہ دوسروں کو نظر آیا ہوگا لوگ تو بس میرے اور تمہارے تعلق کو ٹھیکرے کی مانگ سمجھتے رہے ____

برجیس نے ایک گہری سانس لی۔'' [۴۵]

ناولٹ یا ناول میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ ماحول کی بھی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ماحول ناولٹ/ ناول کے کلی تاثر کو اُبھارنے میں انتہائی معاون ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ بعض ناولوں میں ماحول کے زیرِ اثر کردار اور پلاٹ یا حالات و واقعات تشکیل پاتے ہیں اور بعض ناولوں میں حالات و واقعات اور کرداروں کے زیرِ اثر ماحول کی تشکیل ہوتی ہے۔ متذکرہ ناولٹ دوسری قسم کے زُمرے میں آتا ہے۔ یہاں ماحول، کرداروں اور حالات کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے ناولٹ کا ماحول افسردہ اور دلگیر زیادہ ہے اور پوری طرح حالات و واقعات سے مناسبت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ زاہدہ حنا نے ماحول کو واقعات اور کرداروں کی مناسبت سے تخلیق کیا ہے۔ اگرچہ ماحول میں کہیں کہیں تناؤ کی شدت زیادہ محسوس ہوتی ہے، مگر یہ تناؤ موضوع کا ناگزیر حصہ ہے جس سے موضوع میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔

'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' پلاٹ کے حوالے سے بھی قابلِ ذکر ہے۔ اس کا اس حوالے سے تو چُست کہلائے گا کہ اس میں نہ صرف یہ کہ غیر ضروری واقعات بالکل نہیں ہیں بلکہ غیر ضمنی قصہ بھی داخل نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ضمنی کردار بھی صرف اسی حد تک مداخلت کرتے ہیں جس حد تک ناولٹ کے واقعات اور تاثر کے اُبھار کو ان کی ضرورت ہے، لیکن یہ پلاٹ اُن معنوں میں چُست نہیں جو پلاٹ کی کلاسیکی تعریف کے مطابق کہا جاتا ہے یعنی واقعات کا لگے بندھے اور سراسر منطقی انداز میں ظہور پذیر ہوتے چلے جانا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس ناولٹ کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے ہاں اس میں لچک ضرور ہے لچک دار پلاٹ کی اہمیت پر ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنی تصنیف 'ناول کیا ہے' میں خوب روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''پلاٹ لچک دار ہوتو اچھا ہے ورنہ مکمل اور گٹھا ہوا پلاٹ ریاضی کا فارمولا ہو جاتا ہے۔ بڑے ناول نگاروں کے پلاٹ مکمل گھٹے نہیں ہوتے ورنہ قصے کی اثر انگیزی ہی ختم ہو جائے۔'' [۴۶]

لیکن زاہدہ حنا نے پلاٹ کی لچک کو اُسی حد تک برتا ہے جو ناولٹ کے لیے قابلِ قبول ہو سکتی تھی، کیونکہ پلاٹ میں لچک کی گنجائش جس قدر ناول میں نکل سکتی ہے اُس قدر ناولٹ میں نہیں نکل سکتی۔ اس لیے یہ ناولٹ پلاٹ کی چستی اور لچک داری دونوں کے امتزاج کا حسین مرکب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات کی ترتیب نہ ہونے کے باوجود صرف منتخب ہونے کی وجہ سے پلاٹ چست بنتا ہے اور ضمنی کرداروں کی پیش کش بھی اس چستی کو متاثر نہیں کرتی۔ صرف فلیش بیک کی تکنیک ہے جو پلاٹ کے روایتی تصور کو گزند پہنچا کر لچک دار پلاٹ کو ترویج دیتی ہے۔

زاہدہ حنا کا ناولٹ اُن کے تاریخی شعور کا غماز ہے۔ تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس سے زاہدہ حنا کو عشق کی حد تک لگاؤ ہے، لیکن قدیم تہذیبوں اور عقائد میں سے زاہدہ حنا زرتشت عقیدے سے خود کو زیادہ قریب محسوس کرتی ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ناولٹ میں پارسی تہذیب اور کلچر کی کراچی کے منظر نامے میں بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔ زاہدہ حنا کے اس تاریخی شعور کے بارے میں فاطمہ حسن لکھتی ہیں کہ

''وہ قدیم تہذیبوں میں زرتشت کی تہذیب سے متاثر ہیں اور بہت سے ماہرین علم البشر کی طرح یہ بات پیشِ نظر رکھتی ہیں کہ ہمارے خطے کی تہذیب کی بنیاد زرتشتی مذہب پر ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے کلچر پر عرب سے زیادہ عجم کا اثر ہے اور اس طرح ہمارا سلسلہ دراصل عجم کی تہذیب سے ملتا ہے۔ زاہدہ حنا نے بار بار اس المیے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عجم کی تہذیب مختلف بہانوں سے تباہ کی گئی ___ زاہدہ کا دُکھ اپنی ذات کا دُکھ نہیں بلکہ نسلوں کی تباہی کا دُکھ ہے۔'' [۴۷]

زاہدہ حنا کا پورا ناولٹ تنہائی کے احساس اور بے خبری کو ساتھ لے کر چلتا ہے اس سے فضا میں تاثر کی وحدت پیدا ہوتی ہے، لیکن اس وحدت سے جس کثرت کا ظہور ہوتا ہے اس کا اظہار یہ پورا ناول ہے، لیکن ساری کثرت آخر میں پھر اُسی وحدت میں ڈھل جاتی ہے اور ایک

خوبصورت اختتامیہ تخلیق ہوتا ہے۔ایک نظر دیکھئے اور خود فیصلہ کیجیے۔

''روشن سُرنگ میں سفر شروع ہوا، اس سفر کے اختتام پر سچ کی کوئی چوکھٹ نہ تھی۔ برجیس دا ور علی چنگھاڑتے ہوئے پرندے کے پیٹ میں آگے بڑھتی گئی ہر طرف بے خبری تھی اور بے خبری کے اس نئے سفر میں تنہائی اس کا ہاتھ تھامے ساتھ چل رہی تھی۔'' [۴۸]

اُسلوب ناول کی ہیئت کا ایک اہم عنصر ہے۔اُسلوب کی جامع تعریف میلان کنڈیرا نے یوں کی ہے:

''بے شک، ایک ناول کی زبان کو بیان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔الفاظ اپنے موضوع کی تشکیل خود کرتے ہیں۔ ناول نگار اپنی بیانیہ مہم میں کامیاب رہا ہے یا ناکام۔اس کو جاننے کا صرف ایک طریقہ ہے یعنی یہ فیصلہ کیا جائے کہ آیا اس کی نگارش کے ذریعے فکشن زندہ رہتا ہے۔اپنے کو اپنے خالق اور حقیقی زندگی سے آزاد کرتا ہے اور پڑھنے والے ہر ایک پر خود مختار حقیقت کے قالب میں غلبہ آور ہوتا ہے یا نہیں۔'' [۴۹]

یعنی متن کے ذریعے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ ناول حیات افروز ہے یا بے جان ہے تو زاہدہ حنا کا ناولٹ 'نہ جنوں رہا نہ پری رہی' میں زندہ رہنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور قاری بڑی دیر تک اس کے سحر میں مبتلا رہتا ہے۔

بلاشبہ ہم اس ناولٹ کو اُردو کے چند بڑے ناولٹوں میں شمار کر سکتے ہیں۔'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' اُسی فہرست میں شامل ہے جس میں راجندر سنگھ بیدی کا 'ایک چادر میلی سی'، سجاد ظہیر کا 'لندن کی ایک رات'، قرۃ العین حیدر کے 'دُلربا'، 'چائے کے باغ'، 'اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'، 'ہاؤسنگ سوسائٹی'، انتظار حسین کا 'دن اور داستان' اور عبداللہ حسین کا 'قید' شامل ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز شیریں: ''معیار''، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء، ص ۲۷۔

۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''افسانہ حقیقت سے علامت تک''، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ء، ص ۸۱-۸۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۸۳۔

۴۔ ایضاً، ص ۸۴۔

۵۔ وقار عظیم، سید: ''فن افسانہ نگاری''، لاہور، اُردو مرکز، ۱۹۶۱ء، ص ۹۸۔

۶۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''، کراچی، دانیال، ۱۹۹۶ء، ص ۱۷۵-۱۷۷۔

۷۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: ''آزادی کے بعد اُردو ناول''، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۶۵-۶۶۔

۸۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''، ص ۲۲۹۔

۹۔ ایضاً، ص ۲۱۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۰۸۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۳۳۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۰۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔

۱۸۔ مظہر جمیل، سید: ''آشوب سندھ اور اُردو فکشن''، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء، ص ۲۷۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۴۔

۲۰۔ فاطمہ حسن: ''دورۂ امریکہ: ملاقاتیں، یادداشتیں''، مشمولہ ''قومی زبان''، کراچی، جلد نمبر ۸۶، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۴ء، ص ۸۸۔

۲۱۔ عذرا لیاقت: ''بیسویں صدی کی نمائندہ افسانہ نگار خواتین''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فِل اردو، ملتان، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۰۔

۲۲۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''، ص ۲۲۵-۲۲۶۔

۲۳۔ مرزا مقبول بیگ بدخشانی: ''ادب نامۂ ایران''، لاہور، نگارشات، س ن، ص ۱۰۔

۲۴۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''، ص ۳۰۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۰۳۔

۲۷۔ پریم چند: ''مضامین پریم چند''، مرتب: پروفیسر عتیق احمد، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۱ء، ص ۲۰۹۔

۲۸. Liddel, Robert: "A Treatise on the Novel", Jonathan, Cape Town, LOndon, 1965, P.26.

۲۹۔ میلان کنڈیرا: ''ناول کا فن'' (مترجم) محمد عمر میمن، کراچی، شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۵۰۔

۳۰۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''، ص ۲۳۴۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۳۶۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۳۸۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۱۸۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۶۵-۲۶۶۔

۳۶۔ ایضاً،ص ۲۶۸۔

۳۷۔ ایضاً،ص ۲۶۸۔

۳۸۔ ایضاً،ص ۱۸۰۔

۳۹۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: ''آزادی کے بعد اُردو ناول''،ص ۳۸۔

۴۰۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''،ص ۱۹۱۔

۴۱۔ ایضاً،ص ۲۱۷۔

۴۲۔ ایضاً،ص ۱۹۰۔

۴۳۔ ایضاً،ص ۲۵۹۔

۴۴۔ ممتاز شیریں: ''معیار''،ص ۱۶۔

۴۵۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''،ص ۲۱۸۔

۴۶۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر: ''ناول کیا ہے؟'' کراچی، الکتاب، ۱۹۶۵ء،ص ۳۲-۲۴۔

۴۷۔ فاطمہ حسن: ''کتابِ دوستاں''، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء،ص ۸۱۔

۴۸۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''،ص ۳۰۴۔

۴۹۔ ماریو برگس یوسا: ''نوجوان ناول نگار کے نام خط'، مترجم محمد عمر میمن، کراچی، شہر زاد پبلشرز، ۲۰۱۰ء،ص ۳۶۔

باب پنجم:

زاہدہ حنا بحیثیت مترجم

زاہدہ حنا بحیثیت مترجم

ہلاکت گریز عالمی سیاست: گلین ڈی پیج

دُنیا میں جنگ اور تشدد کا کاروبار منافع بخش ہوسکتا ہے لیکن اس بات کو کوئی نہیں سمجھ رہا کہ بہت سے لوگوں کے لیے یہ تباہی و بربادی اور ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بھی ہے۔ اسی نقصان پر زاہدہ حنا کا قلم افسردہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں ہلاکت، تباہی، بربادی، غارت گری کی تاریخی روایات، موجودہ توضیحات اور آئندہ کے امکانات پر بحث کرتی نظر آتی ہیں اور پوری عالمی صورتِ حال کا منظر نامہ قاری کے سامنے پیش کر کے زور دیتی ہیں کہ ہم ایک نئے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جہاں امن کے بغیر اب گزارا ممکن نہیں۔ یہاں امن کے قیام کے پرانے طریقے اور حل فرسودہ ہو چکے ہیں ہمیں اقدار، نظریات اور نئے تصورات کو اپنانا ہوگا۔ ماضی کا خول توڑ کر باہر نکلنا ہوگا۔ تاریخ میں تشدد اور تخریب کی زنجیروں کو توڑنے کا واضح ادراک اور حکمت عملی بھی ان کی تحریر میں موجود ہے۔

پچھلے کچھ عرصے سے انسانی حقوق کی تنظیمیں احترام آدمیت کے حوالے سے کچھ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں لیکن اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں کہ پوری دنیا میں پُرتشدد واقعات بڑے پیمانے پر رونما ہو رہے ہیں۔ تاریخ دان اور سیاسی مفکرین ان واقعات اور دُنیا میں جاری و ساری تصادم کی لہر کی وجوہات جاننے میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اس سوال کے جواب کے متلاشی ہیں کہ دنیا میں ہر طرف تصادم اور جنگ کا بازار کیوں گرم ہے؟ دنیا کی جغرافیائی تقسیم میں مقید ممالک میں اندرونی اور بیرونی طور پر خون کی ہولی کیوں کھیلی جا رہی ہے؟ زاہدہ حنا کی تحریر کا بنیادی سوال بھی یہی ہے ''ہم قتل کیوں کرتے ہیں'' یہ سوال وہ افسانوں، ناول، کالمز اور مضامین میں اٹھاتی نظر آتی ہیں اور ایسے ہی افراد جو امن، سکون، عدم تشدد پر مبنی نظریات کی ترویج کرتے

ہیں ان کو اپنے قریب محسوس کرتی ہیں۔ اس قربت کا بہترین نمونہ گلین ڈی پیج کی کتاب "Nonkilling Global Political Science" کا اُردو ترجمہ ''ہلاکت گریز عالمی سیاست'' کی صورت میں سامنے آیا۔

یہ پہلی کتاب ہے جس میں "Non-Killing" جیسا لفظ ٹائٹل میں سامنے آیا۔ یہ کتاب پوری دُنیا میں سیاسیات سے وابستہ افراد کو مخاطب کرتی ہے اور ایسے افراد سے مکالمہ کرتی ہے جو دُنیا میں عدم تشدد پر مبنی پُرامن معاشرے کے خواہاں ہیں۔

زاہدہ حنا کے ترجمہ پر گفتگو سے قبل میں اس کتاب کا مختصر تعارف پیش کروں گی کہ آخر کون سے ایسے چونکا دینے والے خیالات مصنف نے بیان کیے ہیں کہ اسے اس قدر پذیرائی ملی۔

کتاب کو Center for Global Non-Killing نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ کتاب کا انتساب Richard C. Syden اور H. Hubert Wilson کے نام ہے۔ پیش لفظ James A. Robinson نے تحریر کیا ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب میں تقسیم ہے۔ کتاب کے آخر میں چار ضمیمہ جات A.B.C.D کے عنوانات کے تحت شامل کیے گئے ہیں اور آخر میں Bibliography ہے۔ زاہدہ حنا نے Non-killing کا ترجمہ ''ہلاکت گریز'' سے کیا ہے اور اس کتاب کی طرف قاری فوراً متوجہ ہوتا ہے اور اس نئے نقطہ نظر کو پڑھنے کا خواہاں نظر آتا ہے۔

Glean D. Paig یونیورسٹی آف ہوائی میں پروفیسر ایمریٹس ہیں۔ وہ ۱۹۵۴ء سے غیر منافع جاتی مرکز برائے عالمی عدم تشدد (CGNV) کے بانی اور صدر رہے۔ وہ درس وتدریس کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ اُنہوں نے سیول نیشنل یونیورسٹی کے گریجویٹ اسکول آف بزنس ایڈمنسٹریشن، پرنسٹن یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف ہوائی میں بھی تدریسی خدمات سرانجام دیں اور بہترین کتب کے مصنف ہیں۔ اُنہوں نے خاص طور پر عدم تشدد اور ہلاکت گریزی کے موضوع پر کئی تحقیقی مقالات تصنیف کیے ہیں۔

''ہلاکت گریز عالمی سیاست'' ان کے پچاس برس کے علمی وتحقیقی تجربات کا نچوڑ ہے۔ ان تجربات کا آغاز ان کی کورین جنگ میں شمولیت سے ہوا، جس کے بعد علم سیاست کے اس ماہر کی قلب ماہیت اس طرح ہوئی کہ تشدد پسند اُستاد ہلاکت گریز علم سیاسیات کے ماہر میں تبدیل ہو

گیا۔اس کی قلب ماہیت کی تبدیلی کو زاہدہ حنا نے ان الفاظ میں ترجمہ کیا ہے۔

> ''ایک دن اچانک برقی توانائی کی طرح کا ایک کوندا ان کے دماغ تک پہنچا جہاں تین خاموش لفظ بول اُٹھے۔اب مزید قتل نہیں No more killing یہاں سے ان کی سوچ اور فکر میں گہری تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔''

یہ وہ خواہش ہے جو زاہدہ حنا جیسے انسان دوستوں میں پائی جاتی ہے۔یہی نقطہ نظر زاہدہ حنا کو ترجمہ پر اُکساتا نظر آتا ہے کہ صرف اُردو ادب ہی نہیں پوری دنیا کے امن پسند دوست کام کر رہے ہیں۔

وہ ہلاکت گریز (Non-Killing) تصور کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ علم سیاست کا وسیع مطالعہ اور عالمی سیاست کا فیصلہ سازی کے تناظر میں مطالعہ کیا ہے۔صدر Harry S. Truman کے کورین جنگ میں ملوث ہونے کے فیصلے کے تناظر میں عالمی سیاست کا مطالعہ کیا ہے۔عالمی انسانی ہیومن رائیٹس کی تنظیموں کو انسان کی عزت یا اہمیت کے حوالے سے کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن اس حقیقت سے انحراف ممکن نہیں ہے کہ پوری دُنیا میں پُرتشدد، عدم مطابقت یا تصادم جاری ہے۔تاریخ دان اور سیاسی مفکرین اس تصادم کی وجوہات جاننے میں ہمیشہ دلچسپی لیتے ہیں کہ ہر طرف تصادم کا بازار کیوں گرم ہے؟ دنیا کے کچھ ممالک میں ہر وقت اندرونی اور بیرونی طور پر خون کی ہولی کیوں کھیلی جاتی ہے۔زاہدہ حنا سوال کرتی ہے کہ ہم قتل کیوں کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب گلین ڈی پیج کی کتاب دیتی نظر آتی ہے جو حالیہ سیاسی تحقیقی رُجحانات کی عکاسی کرتی ہے جو لوگوں میں وارننگ سسٹم پیدا کرنے کی کوشش ہے کہ مستقبل میں قوموں کے قتل وغارت پر قابو پایا جا سکے۔

اِس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا حصہ تاریخ انسانی کے تناظر میں دُنیا میں ہونے والے قتل وغارت کو موضوع بناتا ہے جبکہ دوسرے حصے میں مصنف نے دلائل کی روشنی میں ہلاکت گریز سماج کے امکانات پر بحث کی ہے۔امن، ہلاکت گریزی اور انسان دوستی کے معاشرے پر ممکنہ اثرات کو اُجاگر کیا ہے۔

گلین ڈی پیج نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ دُنیا بھر میں آبادیات، ماحولیات اور معاشرتی دباؤ کی بنیاد پر تہذیبوں کو درپیش خطرات اور منظم طور پر ہلاکت صرف عرصہ حاضر کا ہی مسئلہ نہیں بلکہ یہ تاریخ میں دور تک چلتا نظر آتا ہے۔ دنیا وحشی پن کا ایک طویل ریکارڈ رکھتی ہے۔ مختلف جدول کے ذریعے پیج نے دکھایا ہے کہ بیسویں صدی خون ریز ترین صدی بن چکی ہے جس میں بے پناہ تباہی بربادی ہوئی اور موجودہ دَور میں انتہا پسندی، مذہبی شدت پسندی میں پھیلاؤ، اقوام متحدہ کا بے اختیار ہونے کا عمل بڑھ رہا ہے۔ لوگ جنگ کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں اور تباہی و بربادی میں تو دلچسپی رکھتے ہیں لیکن جنگ کا دوسرا رُخ یعنی انسانوں پر اس کے اثرات سے دلچسپی نہیں رکھتے۔

ڈی پیج اسی تناظر میں سوال اُٹھاتا ہے کہ کیا دُنیا کو ہلاکت گریز سماج کے لیے کام نہیں کرنا چاہیے؟ لیکن اگر تاریخ انسانی پر نظر ڈالیں تو جواب ''نہیں'' ملتا ہے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ قتل و غارت انسانی معاشروں کی فطرت میں ہے۔ ڈی پیج کی تحریر میں چونکا دینے والی یہ بات ملتی ہے وہ یہ کہ وہ اصرار کرتا ہے کہ ماضی اور مستقبل کو از سرِ نو دیکھا جائے تو بہتری کے امکانات زیادہ روشن ہیں کیونکہ تباہی و بربادی انسانی فطرت کی مجبوری تو ہو سکتی ہے جس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس موضوع پر اپنے مقالے کے نتائج کو آسان، مدلل اور پُر اثر دلائل سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ کتاب اس بات پر زُور دیتی ہے کہ دُنیا کی زیادہ تر آبادی پُر امن لوگوں پر مشتمل ہے جو قتل نہ تو کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی ہونے کے خواہش مند ہیں۔

بحیثیتِ مجموعی یہ کتاب تین باتوں پر اصرار کرتی ہے:

۱۔ وقت کی سب سے اہم ضرورت پُر امن، ہلاکت گریز معاشرے کا قیام ممکن ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ موثر اقدامات کیے جائیں۔

۲۔ علم سیاسیات میں تشدد کی مقبولیت بہت زیادہ ہے اس کے نصاب میں عدم تشدد اور ہلاکت گریزی پر زیادہ زُور دینا چاہیے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ طاقت کو محور بنانے کی بجائے معاشروں کے لیے علم سیاسیات میں عدم تشدد، امن، ہلاکت گریزی کو محور بنانا چاہیے۔

''امن'' ایک ایسی خواہش ہے جسے ہر انسان دوست اپنے اندر پاتا ہے۔ زاہدہ حنا کی

یہی امن پسند طبیعت فکری طور پر گلین ڈی پیج کے اس قدر قریب لے آئی کہ انہوں نے اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ کرنا اپنا فرض سمجھا کہ شاید لوگوں میں امن اور عدم تشدد کا رویہ پیدا ہو سکے۔ لوگوں میں تشدد کو قبول کرنے کے روایتی تصور کو زاہدہ حنا چیلنج کرتی نظر آتی ہیں۔ اس کتاب میں وہ نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے علم سیاسیات کے Voilence کے روایتی خیالات رَد کرتی نظر آتی ہے۔ عدم تشدد پر مبنی خیالات کا ترجمہ کرنے میں وہ روانی ہے جو خود اس کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

''ایسے سماج میں ایسے سماجی رشتے موجود نہیں ہیں جن کو برقرار رکھنے یا تبدیلی لانے کے لیے واقعتاً ہلاک یا ہلاک کرنے کی دھمکی دینا ضروری ہو۔ اپنی حمایت میں چیلنج کرنے کے لیے ہلاک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ایسا سماج پابندیوں سے آزاد اور تضادات سے پاک یا تنازعات سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کا ڈھانچہ اور اس کے اعمال نہ تو ہلاکت سے اخذ کیے جاتے ہیں نہ ہلاکت پر منحصر ہیں۔ اس میں جائز یا ناجائز ایسا کوئی پیشہ موجود نہیں ہوگا جس کا مقصد ہلاکت ہو۔''

ترجمہ نگاری بذاتِ خود ایک بہت بڑا فن ہے اور کسی بھی سماج کو سمجھنے میں تخلیق اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایک سماجی گروہ کا دوسرے سماجی گروہ سے سماجی رشتہ قائم ہونے پر ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لیے ترجمہ کا سہارا لینا ضروری ہوتا ہے اور ترجمہ نگار کا کمال یہ ہے کہ ترجمے کیے ہوئے فن پارے کو ترجمہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔

ترجمہ دراصل مترجم کو دوطرفہ جنگ میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ جنگ اس زبان سے بھی ہوتی ہے جن میں ترجمہ کیا جا رہا ہو اور اس زبان بھی جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہو کیونکہ خود اپنی زبان کے حدود اور امکانات سے روشناس بھی کراتا اور بذاتِ خود تحقیق بن جاتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ سطریں ہیں:

''ایک گروپ کے سامنے جب عدم تشدد پر مبنی علم سیاسیات کا سوال رکھا گیا تو ایک پروفیسر نے اجلاس کے بیشتر شرکاء کی مشترک رائے کا اظہار

کیا ''ہم جانتے ہیں کہ انسان فطرتاً متشدد نہیں ہے'' تاہم اُنھوں نے مزید کہا ''ہمیں اپنے تحفظ کے لیے لڑنا پڑتا ہے'' اگر ابتدائی دلیل کہ انسان فطری طور پر ناگزیر حیثیت میں متشدد ہیں کے حوالے سے سوال کیا جائے تو یہ امکان سامنے آتا ہے کہ ان حالات کا کھوج لگایا جائے جن کے تحت کوئی شخص قتل کرنے سے باز رہتا ہے۔''

''شہرزاد مغرب میں'' فاطمہ مرنیسی

زاہدہ حنا کو عالمی شہرت یافتہ داستان ''الف لیلیٰ ولیلہ'' کی باکمال اور صاحب جمال داستان گو ''شہرزاد'' سے بے پناہ دلی اور جذباتی لگاؤ ہے اور اسی لگاؤ کا ثبوت اُنھوں نے فاطمہ مرنیسی (1940-2015) کی کتاب "Scheherazade Goes West" کو ''شہرزاد مغرب میں'' کے عنوان سے اُردو میں ترجمہ کر کے دیا۔ مراکش کے مشہور شہر ''فیض'' میں پیدا ہونے والی فاطمہ مرنیسی اہم مسلم دانشور، مورخ اور فیمینسٹ کے طور پر شہرت رکھتی ہیں۔ اُنھوں نے پہلے فیض اور پھر رباط میں تعلیم حاصل کی۔ فرانس کی Sorbone University سے علم سیاسیات کی ڈگری لی اور امریکہ کی Brandels University سے Sociology میں ڈاکٹریٹ کیا۔ اپنے سماجی سیاسی ماحول میں مسلم عورت بطورِ خاص عرب دُنیا کی مسلمان عورتوں کے بارے میں سوچ کی بدولت جلد ہی دنیا میں اپنی الگ شناخت قائم کی۔ ان کی چند مشہور کتب مندرجہ ذیل ہیں:

1. The Veil and the Male Elite: A Feminist Interperate of Women's Right in Islam
2. The Forgotton Queen of Islam
3. Dreams of Trespass: Tale of a Haram Girlhood
4. Beyond the Veil
5. Haram Politique
6. Women's Rebellion & Islamic Memory
7. Women and Islam
8. Scheherazade Goes West

اِس کے کام کی بدولت 2003ء میں Prince of Asturias Award اور

The Middle East Studies ۲۰۱۷ء میں Susan Sontag ایوارڈ دیا گیا۔
Association نے Fatime Mernissi Book Award کا آغاز کیا۔

فاطمہ مرنیسی نے فرانسیسی اور انگریزی کو ذریعہ اظہار بنایا اور دیکھتے ہی دیکھتے عرب دُنیا کی مشہور ترین شخصیات میں شامل ہوئی۔

''داستان الف لیلہ ولیلہ'' عرب کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ ادب کا ذوق رکھنے والے کہانیوں کے اس وسیع خزانے سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ قصہ مختصراً کچھ یوں ہے کہ یہ ساسانی بادشاہ ''شہریار'' کا قصہ ہے، جو اپنی ملکہ کی بے وفائی کا انتقام اپنی سلطنت کی تمام کنواریوں سے لینے پر تُل جاتا ہے۔ وہ اس بے وفائی کے اسباب پر غور کرنے کی بجائے ''عورت'' ذات سے نفرت میں اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ اس وجود کو صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دے گا، تا کہ دُنیا بہتر طور پر چل سکے۔ وہ ہر رات ایک حسین عورت سے شادی کرتا اور صبح سویرے اس عورت کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتا اور اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس فعل میں اس کا ساتھی ملک کا وزیر اعظم ہے جو اپنی نگرانی میں ایک رات کی دُلہن کے قتل کا بندوبست کرتا ہے۔

اِس صورتِ حال سے پورے ملک میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لوگ اس ظالم بادشاہ سے نجات کا سوچنے لگے۔ سیاسی و معاشی اضطراب و انتشار اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا اور عوامی بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا، لیکن بادشاہ اپنے عزم سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے وزیر اعظم کی بیٹی ''شہرزاد'' نے اپنی دانش اور صلاحیتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے اس سنگین صورتِ حال سے نپٹنے کی ٹھانی اور باپ سے کہا کہ وہ شہریار کی دُلہن بننا چاہتی ہے۔ باپ کی مخالفت کے باوجود وہ اپنے ارادے پر ڈٹی رہی۔ شہرزاد کی شادی کے لیے صرف ایک شرط تھی کہ وہ زندگی کی آخری رات اپنی بہن کو خلوت میں بلا کر کہانی سننے کی فرمائش کرے گی۔ بادشاہ کو اس پر کیا اعتراض ہوتا جب شہرزاد کے پاس زندگی کی چند ساعتیں باقی تھیں۔ یہاں سے داستان سرائی کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو ایک ہزار ایک رات تک چلتا رہا اور ادب کا ایک شہکار ''الف لیلہ و لیلہ'' کی صورت میں سامنے آیا۔

اس داستان کے تحریری وجود کا سراغ نویں صدی میں ملتا ہے۔ سب سے پہلے یہ عربی

زبان میں تحریر کی گئی۔ بعد میں انگریزی، فرانسیسی، اُردو، ہسپانوی، رومن، جرمن، پوش، ڈینش، اطالوی اور دیگر زبانوں میں اس شہکار کے تراجم کیے گئے۔

فاطمہ مرنیسی کے ''شہرزاد'' کے کردار سے جذباتی لگاؤ کی وجہ انتہائی متاثر کن ہے جو اس کی حد درجہ اُلفت کو واضح کرتی ہے۔ اس کی دادی ''دادی یاسمینہ'' جنہوں نے ساری عمر ایک ''حرم'' میں گزاری، بسترِ مرگ پر اُنہوں نے فاطمہ سے کہا کہ

''اپنی دادی کو یاد کرنے کا بہترین انداز یہ ہے کہ تم شہرزاد کی میری پسندیدہ کہانی سنانے کی روایت کو زندہ رکھنا۔''

اور فاطمہ نے اپنی دادی سے محبت کا قرض اسی داستانی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے اُتارا۔ اس کے نزدیک عورت کو اپنے پنکھ استعمال کرنے چاہئیں۔ پرندے کی طرح پوری دُنیا میں اُڑان بھرنا اور اس کے رمز کو سمجھنا عورت کا استحقاق ہے۔ اس کے نزدیک عورت کو ہر دم چوکنا اور سفر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسے اپنی ذہانت کا استعمال شہرزاد کی طرح کرنا چاہیے۔

فاطمہ مرنیسی کی پیدائش ''حرم'' میں ہوئی۔ ایک ایسا روایتی گھر جس میں ہر وقت ''تالے'' پڑے رہتے تھے۔ وہاں کی عورتیں انہیں کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جسے چھوڑنے کی انہیں ممانعت تھی۔ اس نے اپنی کتاب "Dream of Tresspass: Tale of a Haram Girlhood (1995)" کی تشہیری مہم کے لیے دس مغربی ممالک کا سفر کیا۔ اس دوران اس کی ملاقات 100 سے زائد صحافیوں سے ہوئی۔ تب اسے ''حرم'' کے نام پر مختلف لوگوں کے رویوں نے حیرت زدہ کر دیا۔ اسے احساس ہوا کہ مغربی مرد کے لیے ''حرم'' کا لفظ صرف جنسی خیالات کی ترغیب کا باعث بنتا ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں خوبصورت خواتین مردوں کی جنسی آسودگی میں ہی خوش رہتی ہیں جبکہ اسلامی کلچر میں ''حرم'' کا تصور اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک ایسی خطرناک جگہ ہے جہاں جنسی برتری کے لیے خواتین مردانہ اختیارات کی نمایاں مثال ہیں۔ وہ اپنے ''نطق'' کو استعمال کرتے ہوئے ایسی پیچیدہ اور سنسنی خیز کہانیاں بادشاہ کو سناتی ہے کہ وہ سوچ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسلامی ماخذات، آرٹ، مذہبی قوانین، ثقافتی تاریخ کا استعمال کرتے ہوئے فاطمہ نے مسلم خاتون کی جنسی برتری کو واضح کیا ہے۔

موجودہ دَور میں نسائی ادب اور نسائی تنقید کا شہرہ ہے اس بدلتی ہوئی صورتِ حال میں

عرب دانشوروں پر داستان ''الف لیلہ ولیلہ'' کی تفہیم نئے سرے کرنا واجب ہے اور اسی غرض سے فاطمہ مرنیسی نے ''شہرزاد مغرب میں'' کے عنوان سے ایک دلچسپ کتاب تحریر کی اور زاہدہ حنا نے بھی داستانی ادب سے اپنے لگاؤ کا ثبوت اس پُر لطف ترجمے سے دیا۔

فاطمہ مرنیسی نے داستان کو روایتی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ ایک نئے زاویے سے دیکھا اور مشرق و مغرب کی حسین عورت کا موازنہ بھی کیا ہے۔ مغرب کے آزادی نسواں کے نظریے کے تناظر میں عرب کی عورت کو ایک نئے انداز میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ فاطمہ کا کمال ہے کہ اس نے ''شہریار'' کی شخصیت کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے نزدیک یہ شخص جنس کا قطعاً بھوکا نہیں ہے، بلکہ اسے ایک نفسیاتی معالج کی تلاش ہے۔ وہ اگر شہرزاد کو کہانی سنانے کی اجازت دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی صورتِ حال کی یکسانیت سے اُکتا چکا ہے۔ وہ کوئی نئی دلچسپ چیز چاہتا ہے۔ شہرزاد نے اسے کہانیوں کے ذریعے احساس دلایا کہ اس کی بیوی کی بے وفائی کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ یوں وہ اپنی دانش سے پوری سلطنت کو بچا لیتی ہے اور اسی کے ذریعے سے تمام عورتوں کو یہ مقام و مرتبہ ملا کر وہ دنیا کو مہذب اور شائستہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

فاطمہ مرنیسی نے حُسن، عورت اور حرم کے بارے میں مردانہ خواہشات کو اس کتاب میں سمیٹا ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے دوہرے معیارات پر بات کرتی نظر آتی ہے۔ یورپ کے دوستوں سے کی گئی گفتگو اور عجائب گھروں کے دوروں کے بعد اپنے نتائج کو سامنے لاتی ہے کہ مغرب کا مرد ایک ایسی عورت کو پسند کرتا ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوف بھی ہے۔ وہ نہ تو بول سکتی ہے اور نہ دماغ رکھتی ہے جبکہ وسطیٰ ایشیا کا مرد ایک ایسی عورت کا دیوانہ ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی ہے جیسا کہ شہرزاد۔

مشرق و مغرب کے اس نظریاتی تصادم کو فاطمہ مرنیسی نے تہذیبی اور ثقافتی سطح پر مباحثے اور مکالمے کے ذریعے واضح کیا ہے۔ عورت کے بارے میں مرد کے اندر کے خوف کو بڑی خوبی سے آشکار کیا ہے کہ مرد بنیادی طور پر عورت سے 'خوفزدہ' ہے اس نے یہ نتیجہ اپنے انتہائی تکلیف دہ تجربے سے حاصل کیا کہ جب وہ امریکہ میں اپنے لیے کپڑوں کی خریداری کے لیے ایک سٹور میں گئی پتہ چلا کہ سائز 4 یا 6 کے علاوہ کسی قسم کے سائز لباس میں دستیاب نہیں۔ اس تجربے نے مغربی حرم کے تصورات اور تابعدار قسم کے حسن کے بنیادی راز فاطمہ حسن پر آشکار کیے۔ اسے احساس ہوا

کہ

''میں پہلی بار اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید مسلم حجاب سے کہیں زیادہ ''سائز 6''
عورتوں پر تباہ کن پابندی کی حیثیت رکھتا ہے ___ مغربی مرد تمام
روشنیاں ''بچی'' نظر آنے والی عورت پر مرتکز رکھتا ہے اور اسے مثالی حسن کا
نمونہ قرار دیتا ہے ___ یعنی حسین نظر آنے والی عورت کو بچکانہ انداز
اختیار کرنے چاہئیں اور انہیں خالی الذہن ہونا چاہیے۔''

اس کے نزدیک مغربی رویے عورت کو دبانے میں مسلمانوں کی نسبت زیادہ خطرناک اور عیار ہیں۔ تمام تر آزادیوں کے باوجود مغرب نے عورت کو ''نقاب'' میں پوشیدہ رکھنے کا اپنا ہی طریقہ اپنا رکھا ہے اور اس تکلیف کی شدت کو صرف وہی عورت ہی سمجھ سکتی ہے جو اس 4,6 کے سائز کے دباؤ میں ہے۔

فاطمہ حسن کی یہ مسحور کن تحریر ایسے حقائق کو بے پردہ کرتی نظر آتی ہے جس پر آج سے پہلے سوچا بھی نہیں گیا۔ وہ سکے کے دونوں رُخ یعنی مشرق اور مغرب کو سامنے رکھ دیتی ہے۔

دُنیا کی تقریباً ہر زبان میں ''داستان الف لیلہ ولیلہ'' کا ترجمہ کیا گیا لیکن شہرزاد کے کردار کو مغربی نمائندگی میں اسے صرف ایک بیلٹ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ فاطمہ نے اس کردار پر پڑنے پردوں کو ہٹا کر اس کی اصل روح کو دُنیا کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

مشہور امریکی لکھاری، نقاد ایڈگر ایلن پو نے داستان کو انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے عجیب اور حیران کن اضافہ کیا جو اس کی ذہنی سطح اور معاشرتی نفسیات کو بیان کرتا ہے کہ اس نے شہرزاد کو آخری باب میں قتل کر دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہرزاد اپنے قتل کے فیصلے کو تقدیر سمجھ کر بخوشی تسلیم کرتی ہے کیونکہ اس کے پاس کہنے کو کچھ نیا نہیں رہا۔

اسلامی دُنیا مصوری کی عظیم الشان روایت رکھتی ہے۔ ان میں نسائی حُسن کی نمائندگی بھرپور طریقے سے کی گئی ہے۔ اکثر انہیں جنگجویانہ انداز میں دُنیا کو بدلتے اور مہمات سر کرتے دکھایا گیا ہے۔ مسلمان حکمران اپنے شوق کی بدولت یہ تصاویر بنواتے اور عوام کی پہنچ سے انہیں دور رکھتے تھے کیونکہ میوزیم کا تصور خالص مغربی ہے۔ اسلامی دنیا میں میوزیم کی خاص سرپرستی کبھی نہیں کی گئی۔

مغربی مصوری میں ہمیشہ 'حرم' کی عورت کو عریاں ہی پینٹ کیا گیا ہے۔ فرانسیسی مشہور مصور Jean-Auguste-Dominique کی مشہور پینٹنگ "Turkish Bath" اور دیگر مصوروں کی تصاویر دیکھ کر اسے اندازہ ہوا کہ مغربی مرد نے جب 'حرم' کی تصویر بنائی تو اس میں وہ خود موجود نہیں جبکہ مسلمان مصوروں نے جب حرم کی تصویر بنائی تو وہ خود بھی اس میں موجود تھے۔ فاطمہ لکھتی ہیں:

''مغربی مصوری میں شہوانیت ہمیشہ مرد دیکھنے والے کی نظر سے دیکھی گئی جس نے ایک بے لباس عورت کو ایک چوکھٹے میں منجمند کر دیا۔''

جرمن نژاد ایمانوئیل کانٹ جیسا ترقی پسند مرد بھی حسن اور ذہانت کو ایک دوسرے سے بالکل جدا قرار دیتا ہے۔

۱۷ ویں صدی جسے خرد افروزی کی صدی کہا جاتا ہے اس صدی میں بودلیر اور جیسے خیالات رکھنے والے ادیب اپنے ڈراموں کے ذریعے فرانسیسی دربار کو تعلیم یافتہ عورت پر قہقہے لگانے کا موقعہ فراہم کرتا تھا۔ وہ عورتیں جو سائنسی انکشافات کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ان ڈراموں میں بدصورت، کریہہ اور نفرت انگیز کردار کے طور پر پیش کی جاتیں۔

ان مختلف چیزوں میں ربط فاطمہ نے اس طرح ڈھونڈا کہ ذہن سے عاری حُسن مغرب کا پسندیدہ تصور ''حرم'' ہے۔ یعنی عورتوں کو جیومیٹری علم الہیات یا تاریخ نہیں پڑھنی چاہیے۔ یعنی وہ تمام شعبے جو خلیفہ کا دل مٹھی میں کرنے کے لیے مشرق وسطیٰ میں لازم تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے مشرق اور مغرب کا موازنہ کرتے ہوئے فاطمہ مرنیسی لکھتی ہیں۔

''ہارون الرشید جیسا مطلق العنان بادشاہ گستاخ و بے باک اور ذہین کنیز کو سراہتا تھا جبکہ اٹھارویں صدی کے یورپ میں کانٹ جیسا فلسفی قوتِ گویائی سے محروم عورت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ محسوسات اور عقل کے درمیان اتنا نا قابلِ یقین فاصلہ!''

ترجمہ کا فن ترجمہ نگار کے لیے مختلف اُصول وضوابط اور شرائط کا تقاضا کرتا ہے۔ مترجم کو وسیع المطالعہ ہونا چاہیے تا کہ وہ جس موضوع کا ترجمہ کر رہا ہے اس کی تہذیب وادب سے واقف ہو اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تحریر کے پسِ منظر سے بھی آگاہ ہو۔ ادبی رُجحانات،

تہذیب، ثقافت اور ماحول کے بارے میں بھی مکمل معلومات رکھتا ہو۔

ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان کا سفر ہے جس میں زبان، ادب، معاشرے کے اہم رسم ورواج، ماحول دوسری زبان میں منتقل ہوتے ہیں۔ اس لیے تراجم دو تہذیبوں کا نہ صرف اظہار ہوتے ہیں بلکہ ان میں پُل کا کام بھی کرتے ہیں۔ مترجم ان افراد کے لیے ترجمہ کرتے ہیں جنھیں دوسری زبانوں پر خصوصاً انگریزی پر دسترس نہیں تاکہ وہ بھی اپنی زبان میں دیگر ممالک کی تحریروں میں پیش کردہ خیالات اور تجربات سے بہرہ مند ہو سکیں اس کے علاوہ یہ قصہ بھی کہ ان خیالات کی روشنی سے ہمارے حضرات کو غور وفکر کرنے اور گفتگو کرنے کے لیے کچھ مفید اشارے مل سکتے ہیں۔ زاہدہ حنا کا ترجمہ ''شہرزاد مغرب میں'' ان تمام صفات پر بخوبی پورا اُترتا ہے۔

ادبی تراجم خاص خوبی کے متقاضی ہوتے ہیں کہ زبان کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ تخلیقی فن کاروں کا سا تخیل بھی ہو جو ترجمہ کرتے ہوئے اس زبان میں رَچ بس جائے۔ زاہدہ حنا میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دونوں زبانوں میں سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ صرف داستان کا ترجمہ ہی نہیں کر رہیں بلکہ اس کے کردار ''شہرزاد'' کے عشق میں گرفتار ہیں۔ اس دلی لگاؤ کو بیان کرنے میں اُن کا قلم ایک سرشاری اور خوشی بکھیرتا معلوم ہوتا ہے۔ اس ترجمے کا جادو قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس تحریر کی خوبی اس کا جیتا جاگتا اُسلوب اور اس میں دوڑتا لہو ہے جو کہیں بھی ترجمہ کا احساس نہیں ہونے دیتا، لکھتی ہیں:

> ''جن اجنبی لوگوں سے تم ملوان پر اپنی توجہ مرکوز رکھو اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم جس قدر کسی اجنبی کو سمجھو گی اتنا ہی تم اپنے آپ سے آگاہ ہو گی اور اتنی ہی بااختیار ہو گی۔ دادی یاسمینہ کے لیے حرم ایک زندان تھا ایک ایسی جگہ جسے چھوڑنے کی عورتوں کو ممانعت تھی یہی وجہ ہے کہ وہ سفر کی تعریف وتوصیف کرتیں اور متعین حدود یا سرحدوں کو عبور کرنے کے موقع کو ایک مقدس استحقاق جانتی تھیں۔''

ترجمہ نگاری میں جملہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر جملے کی ساخت پر پوری طرح توجہ نہ دی جائے تو تحریر کی روح متاثر ہوتی ہے۔ خیال کا تسلسل قائم نہیں رہتا اور سب اُکھڑا اُکھڑا معلوم ہوتا ہے لیکن زاہدہ حنا نے جملے اتنے مکمل اور خوبصورت انداز میں تحریر کیے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُن

کے اندر کی آواز ہے۔ان کے ترجمہ میں کسی جبر کا احساس نہیں ہوتا۔نہ ہی نصابی زبان ہے، بلکہ اوّل درجے کے تخلیقی فن کار کی متانت اور اظہار کا دلنشیں پیرائیہ قدم بہ قدم ملتا ہے کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ ترجمہ تخلیق کی مکمل توجیہہ نہیں دے سکتا اس لیے ترجمہ عقل اور ذہانت کا ثمر ہوتا ہے۔

زاہدہ حنا بطور فیمنسٹ بہت زیادہ پہچانی جاتی ہیں۔عورت کے حقوق کو لے کر ان کا قلم ہمیشہ رواں رہا ہے۔'شہرزاد' سے محبت کے علاوہ فاطمہ مرنیسی کی کتاب سے اس قدر لگاؤ کی ایک وجہ عورت کی ذہانت و طاقت اور مرد کے اس کی آواز کو دبانے کے حربوں پر پڑے نقاب ہٹانا بھی شامل ہے۔مشرق میں عورت کو روایتی طریقوں سے دبایا جاتا ہے لیکن بظاہر آزادیِ نسواں کا علمبردار یورپ بھی عورت سے خوفزدہ ہے۔اس نے عورت کو فیشن کے نام پر اپنا غلام بنا رکھا ہے جو زیادہ خطرناک ہے۔اس نے عورت کو لباس کے 4 اور 6 سائز کے شکنجے میں قید کر دیا ہے۔مغرب کا عورت کے بارے میں خطرناک رویہ یوں سامنے آتا ہے:

> ''میرے خیال میں یہ مغربی رویے مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک اور عیار ہیں کیونکہ یہ حجاب آیت اللہ حضرات کے مکان کے حوالے سے کیے جانے والے حجاب سے کہیں زیادہ دیوانگی پر مشتمل ہے۔''

مغرب نے کم سن عورت پر روشنی مرتکز کر کے عمر رسیدہ پختہ عورت کو بدصورتی کے کفن میں لپیٹ دیا ہے کیونکہ ان کا فیشن 'مرد' کے ہاتھ میں ہے جبکہ مشرق کی عورت خود فیشن کرتی ہے اور نسبتاً آزاد ہے، جبکہ مغرب میں دلرُبا نظر آنے کے لیے جتن کرتی تعلیم یافتہ عورت حرم کی ایک کنیز بنی نظر آتی ہے۔اس خطرناک صورتِ حال میں فاطمہ مرنیسی مشرقی ہونے پر خوشی کا اظہار کرتی ہیں اور زاہدہ حنا کا قلم اس خوشی میں برابر کا شریک یوں نظر آتا ہے۔

> ''یا اللہ میں تیری شکر گزار ہوں کہ تو نے سائز کے حرم کے عذابوں میں نہیں ڈالا۔یا اللہ میں اس قدر خوش ہوں کہ ہماری قدامت پسند اشرافیہ لباس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔اگر ہمارے رجعت پسند حجاب کی بجائے ہم عورتوں کو سائز '6' پہننے پر مجبور کرنے لگیں تو کیا ہوگا؟''

باب ششم:

زاہدہ حنا کی افسانوی تخلیقات
(نتائج ومحاکمہ)

زاہدہ حنا کی افسانوی تخلیقات

(نتائج ومحاکمہ)

اکیسویں صدی کا آغاز ہی دہشت، بربریت اور جنگ وجدل سے ہوا، لیکن یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے کہ ادوار یا زمانے فضا میں ظہور نہیں پاتے اور نہ ہی ان میں ہونے والی تبدیلیاں آناً فاناً ہوتی ہیں۔ زمانے کا مزاج مختلف عوامل کے زیرِ اثر اور درجہ بدرجہ ترتیب پاتا اور اپنی تبدیلی کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا اکیسویں صدی کے اولین چودہ برسوں میں انسانی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی رجحانات کو سمجھنے کے لیے گزشتہ صدی میں ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ جنگِ عظیم اوّل و دوم، ہیروشیما اور ناگاساکی کی ایٹمی تباہی و بربادی، برصغیر میں آزادی کی جدوجہد، پاکستان کا قیام اور بہت بڑے پیمانے پر لوگوں کی ہجرت، ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور امریکہ کا ۹/۱۱ یہ وہ واقعات ہیں کہ جنہوں نے اکیسویں صدی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔

ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہوتا ہے اس لیے ہر عہد کے تغیرات کی نوعیت، کیفیت اور اس عہد کے انسان کے دل و دماغ پر اُن کے اثرات سے ادب قارئین کو آگاہ کرتا ہے۔ اس لیے گزشتہ صدی کی تمام تبدیلیوں کا عکاس اُردو ادب ہے۔

۷۰ء کی دہائی میں بہت سے فکشن رائٹرز اپنی تخلیقات سے ادب کا دامن مالا مال کر رہے تھے جن میں اسد محمد خان، حسن منظر، رضیہ فصیح احمد، اے خیام، رشید امجد، انور سجاد، خالدہ حسین، احمد ندیم قاسمی، بانو قدسیہ، منشا یاد وغیرہ شامل ہیں۔ اسی دور میں زاہدہ حنا اپنے منفرد موضوعات اور اُسلوب کی بنیاد پر دنیائے ادب میں اپنی الگ شناخت بناتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے عالمی و ملکی سیاسی و سماجی منظرنامے کو تہہ دار بیانیہ کی صورت میں افسانوی پیرائے میں کمال

مہارت سے ڈھالا اور زندگی کا نئے سرے سے ادراک کرتی نظر آتی ہیں۔

زاہدہ حنا اس عہد کی ایک سنجیدہ، جرأت منداور باغی آواز ہیں۔ان کی تحریروں میں تفکر کا عنصر نمایاں ہے۔وہ اپنی تحریروں میں زماں ومکاں، ماضی وحال اور مشرق ومغرب کے فاصلوں کوختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہیں۔ان کا فکشن موجودہ دور کی ایسی پُر اثر داستان ہے جس میں حقیقت وافسانہ باہم مل گئے ہیں۔زاہدہ حنا باقاعدہ طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں،لیکن معاشرے کو درپیش مسائل ہی کو موضوعِ تحریر بناتی ہیں کیونکہ معیاری ادب کبھی بھی سیاسی، سماجی یا نظریاتی پارٹی لائن کے خارجی مطالبے سے تشکیل نہیں کیا جاسکتا۔ادیب کبھی بھی اپنے عہد سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ وہ ہر صورت اپنے زمانے اور اس کے مسائل سے وابستگی کا اظہار اپنی تخلیقات میں کرتا ہے،لیکن ادب میں جب حدود وقیود قائم کی جاتی ہیں تو پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے اور تخلیقی بہاؤ رُکنے لگتا ہے۔

زاہدہ حنا کی شخصیت کی متنوع جہات ہیں وہ افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار، مضمون نگار اور مترجم کی حیثیت سے اُردو ادب میں بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔

کسی بھی تخلیق کار کو سمجھنے کے لیے اُس کی تخلیقات کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیونکہ تخلیق کار کی شخصیت اس کی تحریر کے پس پردہ جھانکتی ہے۔زاہدہ حنا کی تخلیقات کے مطالعے سے جو شخصیت سامنے آتی ہے اس میں توانائی کے تین بڑے منبع ہیں پہلا تاریخ اور اساطیر کا وسیع مطالعہ اور گہرا ادراک ہے اور دوسرا وراثت میں ملنے والا تصوف کا گہرا رنگ نمایاں ہے اور تیسرا بغاوت اور انکار کا عنصر جو زاہدہ حنا کے ہاں بہت نمایاں ہے اُنہیں انگریز دشمنی کی وساطت سے سامراج دشمنی اور باطن کے خلاف عملی جہاد کا درس ورثے میں ملا ہے۔اِسی نے زاہدہ حنا کے بنیادی مزاج اور فکری ساخت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس لیے اُن کے لہجے میں تیقن اور پُر اُمیدی ہے اور وراثت میں ملی ہوئی آگ اور توانائی کا رنگ نمایاں ہے۔

عرفان وآگہی کے سفر میں زاہدہ حنا سیدھے راستے کو پسند نہیں کرتیں بلکہ انکار کے راستے کو پسند کرتی ہیں۔دانشور اور مفکر انکار کی رہبری کو قبول کرنا پسند کرتے ہیں۔اِسی رہبری کو منصور بن حلاج نے اختیار کیا۔زاہدہ حنا بھی اسی قبیلے کی فرد نظر آتی ہیں انکار اور بغاوت کا علم انہوں نے اپنے وجود کی انتہائی بلندیوں پر نصب کر دیا ہے۔ان کے ہاں فلسفۂ تصوف زندگی سے

عبارت ہے دنیا کو ترک کرنے سے نہیں۔

زاہدہ حنا کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں خاندان اور گھریلو ماحول کا بہت گہرا اثر ہے۔ اُنہوں نے اپنے عہد کے چند گنے چُنے باشعور اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں سے ایک میں آنکھ کھولی کہ جہاں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم و تربیت کا بھی خاص طور پر اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان کی ننھیال اور دادیہال دونوں طرف کی خواتین فارسی اور اُردو کا بہت عمدہ ذوق رکھتی تھیں۔ یہی ذوق زاہدہ حنا کو وراثت میں ملا جسے اُنہوں نے اپنے مطالعے سے تقویت دی۔ زاہدہ حنا کا مطالعہ بہت وسیع ہے، لیکن تاریخ سے اُن کو گہرا شغف ہے۔ ان کی تحریروں میں قدیم تہذیب اور وقت میں سانس لینا خوشگوار تجربہ ہے۔ اُن کو اپنے ماضی سے والہانہ لگاؤ ہے۔ اُن کی تحریروں میں تاریخ یا صدیاں قاری کے ساتھ سفر کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں سہسرام کی ہر گلی، ہر محلے میں تاریخ قاری کا ہاتھ تھامتی ہے، لیکن زاہدہ حنا کے ہاں بزرگوں کے متعلق بات کرتے ہوئے بعض اوقات عقیدت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

بحیثیت افسانہ نگار زاہدہ حنا کی اُردو دُنیا میں پہچان مستحکم ہے۔ اُن کے اب تک تین افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جو اپنی پیش کش اور ترتیب کے اعتبار سے اپنا مخصوص مزاج رکھتے ہیں۔ ان مجموعوں کے عنوانات ہی سے زاہدہ حنا کے نقطۂ نگاہ اور سوچ کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔

پہلا مجموعہ 'قیدی سانس لیتا ہے' ہے اس مجموعے میں ماضی سے متعلق کسی حد تک رومانوی قنوطیت ملتی ہے۔

دوسرا مجموعہ 'راہ میں اجل ہے' کا عنوان ہی قاری کو چونکا دیتا ہے کیونکہ ہر کوئی یہ خواہش کرتا ہے کہ منزل پر پہنچ کر موت آئے، لیکن زاہدہ حنا موت کو منفرد زاویے سے دیکھتی ہیں اُن کے نزدیک زندگی فانی ہے اور اس لافانی دُنیا میں انسان جس راہ کو بھی اختیار کرے اس کی کوئی منزل نہیں کیونکہ ان لامتناہی راستوں پر موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔ انسان صرف جدوجہد ہی کر سکتا ہے۔ ان کا یہ مجموعہ موت سے پہلے کی اذیتوں اور حلاوتوں کا بیان ہے۔ اس مجموعے میں رومانیت کی جگہ تلخ حقائق نے لے لی ہے۔

تیسرا مجموعہ 'رقصِ بسمل ہے'۔ 'رقصِ بسمل' کے لغوی معنی 'زخمی ناچ' کے ہیں۔ یہ ایرانی

بادشاہوں کی محبوب سزا تھی جس میں سر کٹے انسان کی گردن پر جلتا توا رکھ دیا جاتا اور اس کے تڑپنے سے حکمران طبقہ لُطف اندوز ہوتا تھا۔ زاہدہ حنا نے اپنے اس افسانوی مجموعے میں تاریخ کے تناظر میں آج کے انسان کی اذیت و تکالیف اور مقتدر طبقے کی لطف اندوز ہونے کی اسی روایت کو بیان کیا ہے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی افسانہ نگاری میں بہت اہم ہے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا جس نے تخلیقی ذہن کو ایک نئے المیے سے دوچار کیا جو شکست و ریخت کا تھا۔ اس سے قومی تشخص کا سوال ادب میں سامنے آیا۔ اس دہائی کا ایک اور بڑا واقعہ ۱۹۷۷ء کا مارشل لاء ہے، جس نے ادب کو اور بالخصوص افسانے کو بہت متاثر کیا چونکہ فوجی آمریت کا زمانہ سقوطِ ڈھاکہ اور جمہوری تحریکوں کے بعد آیا اس لیے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔ مارشل لاء کے خلاف ادیبوں کی طرف سے شدید احتجاج کیا گیا۔ مارشل لاء کا تجربہ اور قدروں کا زوال تو ہمارے ہاں پہلے سے ہی چلا آرہا تھا، لیکن اس مارشل لاء نے اپنے ہونے کا کوئی جواز نہیں دیا تھا۔ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ آزادئ اظہار پر لگنے والی پابندی تھی جس کے باعث تخلیقی ذہن نے اپنے اظہار کے نئے پیمانے تراشے اس عہد میں ادیبوں نے علامتی، مزاحمتی اور تجریدی افسانے تحریر کیے۔

زاہدہ حنا باشعور اور تخلیقی ذہن رکھنے والی خاتون ہیں۔ انہوں نے اِس سیاسی جبر کے عہد میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے قلم کو اپنی آواز بنایا اور علامتی انداز میں افسانوں میں صدائے احتجاج بلند کی۔ ضیاء دور کے مارشل لاء کے دوران تحریر کیے گئے افسانوں میں بے خوفی اور جرأت کے ساتھ ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی اور یہ پیغام دیا کہ وہ لوگ جو اپنے آدرش، اپنے نظریات کے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ ان کے لیے موت تو قابلِ قبول ہوتی ہے مگر اپنے نظریات سے پیچھے ہٹنا نہیں۔ معاشرے کے ایسے باغی افراد انسانی عزم و ہمت کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی علامت ہیں اور یہی افراد معاشرے میں مستقبل کے اُجالوں کے ضمانت ہیں۔

عقوبت خانوں کی دردناک صورت گری زاہدہ حنا نے اپنے افسانوں میں اس طرح کی ہے کہ الفاظ میں اِن کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ صرف احساس کی شدت کو محسوس کیا جاتا ہے۔ ظلم، تشدد، ایذارسانی، ہلاکت اور انسانی شعور و ادراک ہی نہیں بلکہ وجود کی تذلیل تک کے حربے آمرانہ ملوکیت تاریخ کے تاریک ادوار میں اختیار کرتی رہی ہے۔ اُن کا تسلسل آج تک جاری

ہے۔اِسی ظلم وستم کا رزمیہ زاہدہ حنا اپنے افسانوں میں لکھتی ہیں اور مظلوم لوگوں کے مدافعتی ردِعمل کو کمال مہارت سے دکھاتی ہیں کہ آدرشی آدمی تمام ہزیمتوں کے باوجود ظلم کے چہرے پر تھوک دیتا ہے۔زاہدہ حنا کے نزدیک ایسی موت زندگی کی شکست نہیں بلکہ زندگی کی توسیع اور تصدیق ہے۔ ان کی تحریریں اِس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ زندگی اور آزادی کا انتخاب کرتی ہیں۔ان کی کہانیوں میں انسان کی موت زندگی کے اِسی انتخاب کے سبب واقع ہوتی ہے۔وہ موت کی منکر ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک موت کے پیالے میں جب تک زندگی کے سکّے نہ ڈالے جائیں آدرش ہاتھ نہیں آتے۔ ہروقت ہرجگہ بغداد، کراچی، قتل گاہوں، ٹارچر کیمپوں میں، ہرصدی میں جہاں بھی ظلم ہوا زاہدہ حنا نے اُسے موضوع بنایا ہے۔اُن کی کہانیاں زماں ومکاں کی حدود سے منکر ہیں۔

آج دنیا میں دہشت گردی اور بربریت سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ زاہدہ حنا اپنے افسانوں میں کراچی اور عالمی سطح پر ہونے والی دہشت گردی کو موضوع بناتی ہیں۔طالبان جنہیں دنیا 'دہشت گرد' قرار دیتی ہے ان کے بارے میں زاہدہ حنا غور وفکر کرتی ہیں اوران اسباب کا تجزیہ کرتی ہیں جن کے تحت وہ افراد جو نہ کسی غلط سرگرمی میں ملوث ہوتے ہیں اور نہ سیاست سے ان کا تعلق ہوتا ہے کس طرح ذاتی اور معاشرتی تجربات ان کو زندگی سے اس حد تک نفرت پر مجبور کر دیتے ہیں کہ 'طالبان' کی صورت میں وہ دنیا کو تباہ کرنے پر تُل جاتے ہیں۔طالبان کے بارے میں اسی طرح کا ہمدردانہ رویہ 'خالدہ حسین' کے ہاں بھی ملتا ہے کہ دُنیا کو مہذب بنانے کے دعویداروں نے دُنیا میں ظلم وناانصافی کو مسلط کر کے دہشت گرد کس طرح تیار کیے ہیں۔

'جنگ' ایسا موضوع ہے جس سے زاہدہ حنا کو شدید نفرت ہے۔وہ جنگ کی مخالف اور امن کی حامی ہیں۔صرف برصغیر ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں کہیں بھی جنگ وجدل کا بازار گرم ہے اس کے خلاف زاہدہ حنا قلم سے احتجاج کرتی ہیں۔ان کا افسانہ 'تنہائی کے مکاں ہیں' عالمی جنگ کی تباہی اور امریکہ کے ایٹم بم کے استعمال کے سیاق وسباق میں لکھا گیا ہے۔زاہدہ حنا نے اس موضوع کو اس لیے نہیں بیان کیا کہ ہم خود ایٹمی ہتھیاروں کی تباہی اور انسانی مستقبل کے خطرات سے دوچار ہیں بلکہ یہ اس بات کی گواہی ہے کہ فنکار ایک سطح پر آ کر رنگ، نسل، قوم، جغرافیے سے ماورا ہو کر صرف اور صرف انسانیت کے لیے آواز بلند کرتا ہے۔انسانیت سے یہی وابستگی ہی اس کے فن کو آفاقیت عطا کرتی ہے۔زاہدہ حنا کے ہاں مقامیت کی بجائے آفاقیت کا عنصر نمایاں ہے۔

وہ افغانستان، عراق، ایران، برما، بنگلہ دیش، جاپان، پاکستان غرض پوری دنیا میں انسانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف لکھتی ہیں۔ان کے نزدیک انسان اس دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز ہے اسی کے دم سے دنیا کی رونق ہے۔اس کی فلاح و بہبود ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔انسانیت کی پائمالی چاہے کسی بھی حوالے سے ہو زاہدہ حنا کو دُکھی کر دیتی ہے اور یہ رویہ ان کی تحریروں میں سچے اظہار کا ضامن ہے۔

زاہدہ حنا کو تاریخ اور اساطیر سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔اُن کا تاریخی شعور کسی ایک سمت میں سفر نہیں کرتا اِس کی مختلف سمتیں ہیں۔ پوری دنیا اِس تاریخی شعور میں سمٹ آئی ہے۔تاریخی آ گاہی اور اساطیر کا گہرا شعور ان کے افسانوں کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔زاہدہ حنا تاریخ کو حال سے جوڑ کر بتاتی ہیں کہ آج سے نہیں ہزاروں سالوں سے انسان پر ظلم وستم کیا جا رہا ہے۔اس کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔انسان تاریخ کے جبر کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکا۔

زاہدہ حنا کے افسانے ہم پر تاریخی نیرنگیوں کے دَر وا کرتے ہیں اِن میں تاریخی جبر بے نقاب ہوتا ہے اور اس کے مقابل وہ عصری جبر کو رکھ کر قاری پر تفہیم کے نئے دَر وا کرتی ہیں۔ان کی دردمندی کسی خاص علاقے یا لوگوں سے مخصوص نہیں بلکہ یہ دردمندی اور توانائی اُن کے ہاں تاریخ کے ادراک سے پیدا ہوئی ہے اور وراثت میں بھی زاہدہ حنا کو دردمندی کا عنصر ملا ہے۔اِس لیے وہ پوری دنیا سے 'درد' کے رشتے سے منسلک ہونے کے باعث قربت محسوس کرتی اور اُن کی تکالیف پر تڑپ اُٹھتی ہیں۔

زاہدہ حنا عصری تقاضوں کو ماضی کے حوالے سے اور کبھی تقابل کر کے رکھتی ہیں، لیکن ماضی کے لیے حسرت و یاس کا رویہ نہیں ملتا۔اُن کا ذہن ماضی پرست یا ناسٹلجیا کا شکار نہیں۔وہ تاریخ کے تناظر میں اپنے عصر کو دیکھتی اور مستقبل کی طرف نظر کرتی ہیں۔شعور کی رو اور فلیش بیک کے ذریعے تاریخ کا سفر زاہدہ حنا کی تحریروں کا موضوع بنتا ہے۔شعور کی رو جدید افسانے کا چلن ہے، لیکن بعض افسانہ نگاروں کے ہاں اس تکنیک کا اضافی استعمال ملتا ہے، لیکن زاہدہ حنا اس تکنیک کا استعمال صرف اس وقت کرتی ہیں جب یہ ناگزیر ہو۔وہ اس کا تجربہ نہیں کرتیں بلکہ اس کے استعمال سے نتیجہ اخذ کرتی ہیں۔وہ نتیجہ جس تک شعور کی رو کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔اسی تکنیک کے ذریعے وہ ایک ہی مقام پر کھڑے کھڑے صدیوں کا سفر طے کر جاتی ہیں۔

زاہدہ حنا کے ہاں 'وقت' خاص موضوع ہے کائنات میں وقت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ انسان وقت کے آگے بے بس ہے۔ ان کے تصورِ وقت کے پیچھے ان کا تجربہ، مشاہدہ، علم اور وسیع مطالعہ کارفرما ہے۔ تصورِ وقت کے حوالے سے خواتین فکشن نگاروں پر نگاہ کی جائے تو قرۃ العین حیدر اور زاہدہ حنا ہی دو ایسے نام ہیں جو نمایاں نظر آتے ہیں، لیکن قرۃ العین حیدر کے ہاں کبھی کبھی وقت مجرد صورت اختیار کر لیتا ہے جبکہ زاہدہ حنا وقت کے تصور کو زندگی میں برت کر دکھاتی ہیں۔ وقت ان کے کرداروں کی زندگی میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ گو وقت کی جبریت کا احساس حاوی رہتا ہے مگر یہ اوپر سے لاگو کیا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔

بطور Feminist زاہدہ حنا کی پہچان مستحکم ہے۔ وہ عورت کے شعورِ ذات اور تاریخ کے تناظر میں عورت پر صدیوں سے روا رکھے گئے مظالم اور مذہب کے نام پر محدود ذہنیت کو اپنی تحریروں میں بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں عورت کی ذات کی شناخت کا سوال اُٹھاتی ہیں۔ عورت کی پوشیدہ صلاحیتوں، دبی خصوصیات اور گونگی طاقتوں کے حق کے لیے آواز بلند کرتی ہیں۔ وہ عورت کی پہچان کا تعین رشتوں سے نہیں بلکہ اس کی صلاحیتوں اور خصوصیات کے حوالے سے کرنے کی بات کرتی ہیں۔ عورت کے حوالے سے زاہدہ حنا کے مضامین کا مجموعہ 'عورت زندگی کا زنداں' بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ متعدد مقالات و مضامین مختلف سیمیناروں مین پڑھ چکی ہیں۔

زاہدہ حنا کے فکشن میں عورت کے مختلف روپ نظر آتے ہیں، لیکن 'جنس' ایک ایسا موضوع ہے جسے زاہدہ حنا نے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ عورت کی ذات کی تکمیل کے لیے 'جنس' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن زاہدہ حنا کے ہاں یہ موضوع سرے سے موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے جنسی استحصال کو بھی زاہدہ حنا اپنی تحریروں کا موضوع نہیں بناتیں۔ اُن کے کالموں میں اِس استحصال کے خلاف ردِعمل ملتا ہے، لیکن کہانیوں میں نہیں۔ اُردو فکشن میں عورت کے جنس اور جنسی استحصال کو بہت زیادہ موضوع بنایا جا رہا ہے، لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ زاہدہ حنا شعوری طور پر اِس موضوع کو اپنی تحریروں میں دَر آنے سے روکتی ہیں۔ عرب شہزادوں کے حوالے سے عورتوں کے استحصال کو بیان کیا ہے جو کہ بہادرانہ اور منفرد فعل ہے، لیکن ہندوستانی معاشرے کے حوالے سے اِس موضوع کو زاہدہ حنا احاطہ تحریر میں نہیں لاتیں۔

افسانے کی سب سے اہم چیز 'کہانی پن' ہے جو قاری کی افسانے میں دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ جدید افسانے میں علامت نگاری، تجریدیت، اینٹی سٹوری اور ایبسرڈ ٹی کی صورت میں یورپ سے تبدیلی کی جو لہر آئی اُس کے نتیجے میں افسانے سے کہانی پن غائب ہو گیا جس کی وجہ سے افسانے میں قاری کی دلچسپی کم ہو گئی، لیکن زاہدہ حنا کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تحریروں میں علامت و ایمائیت ضرورت کے مطابق پائی جاتی ہے۔ اس لیے قاری ان کی تحریروں کا دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہے، لیکن زاہدہ حنا کے تیسرے افسانوی مجموعےکے چند افسانوں میں کہانی پن کا عنصر کسی حد تک کم ہوتا نظر آتا ہے۔ ان افسانوں پر سیاست، استحصال اور دہشت گردی کا رنگ نمایاں ملتا ہے۔ افسانے کی اپنی شعریات ہوتی ہیں۔ ان افسانوں میں زاہدہ حنا کا کالم نگار کا روپ تخلیق کار پر کسی حد تک حاوی ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

تخلیق کار اپنی تخلیقات کا مواد دھرتی سے لیتا ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں اور اکیسویں صدی کے نمایاں رجحانات میں اس عہد کا سب سے بڑا افسانوی تجربہ موت، بربریت اور دہشت کا ہے۔ اگرچہ یہ بہت اعصاب شکن معلوم ہوتا ہے، لیکن وقت اور اس کے حقائق ہی اب یہی ہیں۔ اسی لیے زاہدہ حنا اس عصری حسیت کو اپنی تخلیقات میں بیان کرتی ہیں۔

اُردو ادب میں ناولٹ کا فنی شعور مغرب کی طرح نہیں پنپ سکا۔ اُردو میں خواتین ادیبوں میں قرۃ العین حیدر اور زاہدہ حنا نے پورے فنی شعور کے ساتھ ناولٹ تحریر کیے۔ زاہدہ حنا کا ناولٹ 'نہ جنوں رہا، نہ پری رہی' تکنیکی اور فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس ناولٹ میں زاہدہ حنا نے معدوم ہوتی ہوئی پارسی تہذیب وتمدن کو کراچی کے منظرنامے میں بیان کیا ہے۔ اس ناولٹ کی کہانی بھی ہجرت ہی کے آشوب سے پیدا ہوتی ہے، لیکن پارسی رہن سہن، لب ولہجہ اور ثقافت کی منظرکشی کی وجہ سے اس ناولٹ کو امتیازی مقام حاصل ہو گیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہندوستان کے موضوع پر اُردو ادب میں بہت کچھ لکھا گیا۔ زاہدہ حنا بھی اپنے فکشن میں اس موضوع کو بیان کرتی ہیں۔ ہجرت کے متعلق بات کرتے ہوئے زاہدہ حنا انتہائی کرب کا شکار نظر آتی ہیں۔ اُن کے ہاں ازل سے ہونے والی انسانی ہجرتوں کے خلاف احتجاج کا رنگ ملتا ہے چاہے وہ ہجرت ایران، بیروت، بغداد، بصرہ، ہندوستان اور ۱۹۴۷ء کی یا بنگلہ دیش کی ہو، کیونکہ زاہدہ حنا منقسم خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیئے اس کرب سے آگاہ

ہیں۔ تاریخ کے وسیع مطالعے کے بعد اُن کی ہجرت کا کرب آفاقی ہوگیا ہے۔ زمینوں اور زمانوں میں تاریخ کی وسعت میں پھیل گیا ہے۔ زاہدہ حنا نے افسانوں کے علاوہ اپنے ناولٹ میں تقسیم کے پس منظر میں پُرانے رشتوں کے ٹوٹنے اور نئے رشتوں کے بننے کو موضوع بنایا ہے۔

پاکستان میں موجود اقلیتوں کے دُکھ اور تکالیف کا زاہدہ حنا کو بخوبی احساس ہے اور یہ احساس تاریخ کے شعور سے پیدا ہوا ہے۔ اپنے ناولٹ میں کراچی کے منظرنامے میں پارسی فیملی کے ذریعے اور افسانوں میں بہائی عقیدے کی مٹتی ہوئی تہذیب و روایات کی بہت خوبصورتی سے عکاسی کی ہے۔

قدیم تہذیبوں میں زاہدہ حنا زرتشت مذہب سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک اس خطے کی تہذیب خصوصاً مسلم کلچر پر عرب سے زیادہ عجم کے اثرات ہیں۔ وہ اپنے فکشن میں تاریخ کے تناظر میں دکھاتی ہیں کہ بربریت کی یلغار تمدن کو کس طرح نقصان پہنچاتی ہے۔

زاہدہ حنا کے کردار بہت باشعور اور باصلاحیت ہیں جو مختلف معاملات کے بارے میں اپنی واضح سوچ رکھتے اور اِس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

زاہدہ حنا کی تحریریں کلاسیکیت کا تسلسل قرار دی جاسکتی ہیں۔ کلاسیکی شعراء کے مصرعے، اشعار اور تراکیب کو جابجا استعمال کیا ہے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے کلاسیکی ادب سے استفادہ کرتی اور اپنی تحریروں کی تاثیر میں اضافہ کرتی نظر آتی ہیں۔

زاہدہ حنا بحیثیت کالم نگار بہت زیادہ شہرت کی حامل ہیں۔ ان کے کالم اپنے منفرد طرزِ اظہار اور پیش کش کی بناء پر قارئین میں بے حد مقبول ہیں۔ سیاست زاہدہ حنا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ عالمی و ملکی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے۔ عہدِ جدید میں انسانوں کی تقدیر کا بیان اب سیاست کی زبانی ہوتا ہے کیونکہ آج سیاست چند افراد اور ادارے، ہی نہیں کر رہے بلکہ فلاحی اور سماجی تنظیموں سے لے کر اخلاقی و مذہبی ادارے تک سب سیاست کا حصہ بن گئے ہیں۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ افراد ہی نہیں مُلک بھی سیاست کی اس بساط پر اس عہد میں مہرے بنے ہوئے ہیں۔ عالمی سیاست اور اس حوالے سے ملکی سیاست پر زاہدہ حنا اپنی واضح اور دوٹوک انداز میں رائے کا اظہار اپنے کالموں میں کرتی ہیں۔ دنیا میں جہاں بھی ظلم و استحصال ہو زاہدہ حنا

کی ہمدردیوں کا مرکز مظلوم اور استحصال کا شکار طبقہ ہوتا ہے۔زاہدہ حنا تاریخ کے حوالے سے ناانصافی اور تشدد کے خلاف احتجاج کرتی نظر آتی ہیں۔زاہدہ حنا کے مزاج میں انکساری اور مروت بہت زیادہ ہے اور یہ رنگ ان کے فکشن میں بھی ملتا ہے، لیکن کالم میں، زاہدہ حنا تندو تیز لب ولہجہ میں بات کرتی نظر آتی ہیں۔

تخلیق کار اپنی تخلیق کا مواد اپنے گردو پیش سے لیتا ہے۔زاہدہ حنا جن حقائق کو اپنے کالموں میں بیان کرتی ہیں ان میں سے کچھ کو اپنے تخلیق عمل کا حصہ بنا کر فنکارانداز میں اپنے فکشن کا حصہ بناتی ہیں۔ایسے واقعات جن کو نشرواشاعت کے ممکنہ ذرائع نے گھر گھر پہنچا دیا ہو ان واقعات کے گرد افسانے کا تانا بانا بُننا کمال کی بات ہے کیونکہ اس سے فنِ افسانہ کے حدِ اعتدال سے نکلنے کا خدشہ ہوتا ہے، لیکن زاہدہ حنا نے ہنرمندی، فنی التزام اور خلوص و سنجیدگی کے ساتھ اِن کی ماجرایت کو دائمی صداقت اور اثر انگیزی سے فن پارہ بنا دیا ہے۔

زاہدہ حنا کا کمال یہ ہے کہ وہ حالات و واقعات کو صرف بیان ہی نہیں کرتیں بلکہ ان کے پس پردہ محرکات پر غور کرتی ہیں جس کی وجہ سے قاری اپنے اِردگرد کے ماحول کی تفہیم کرتا ہے۔زاہدہ حنا کے ہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ان کو تاریخی بصیرت اور عصری شعور و آ گہی کے حامل فنکار کی حیثیت سے اِن موضوعات کی داد ملنی چاہیے اور واقعات کے گرد بُنی جانے والی فنکارانہ بافت بے ساختگی اور تاثر پذیری میں زاہدہ حنا درجہ کمال تک پہنچتی نظر آتی ہیں۔

تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تحریر میں ارتقاء نظر آئے جو اُس کے آگے کے سفر کا پتہ دے۔زاہدہ حنا کے ہاں اکیسویں صدی کے بدلتے منظرنامے کے تحت موضوعات میں تبدیلی نمایاں ہے۔ان کے موضوعات اور اُسلوب کی شناخت اُنہیں دیگر لکھاریوں سے ممتاز کرتی ہے۔تاریخی و سماجی شعور، تصوف کا رنگ، سیاسی شعور، تانیثیت، وسیع مطالعہ، توانا اور بے خوف لب ولہجہ وہ عناصر ہیں جس سے زاہدہ حنا کے فکشن کی بُنت ہوتی ہے جو اُسے اُردو ادب کی تاریخ میں دیگر فکشن نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذات:

۱۔ زاہدہ حنا: ''قیدی سانس لیتا ہے''، کراچی، مکتبۂ دانیال،۱۹۸۴ء۔

۲۔ زاہدہ حنا: ''راہ میں اجل ہے''، کراچی، دانیال پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

۳۔ زاہدہ حنا: ''عورت زندگی کا زنداں''، کراچی، شہرزاد پبلی کیشنز،۲۰۰۴ء۔

۴۔ زاہدہ حنا: ''تتلیاں ڈھونڈنے والی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

۵۔ زاہدہ حنا: ''رقصِ بسمل ہے''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔

۶۔ زاہدہ حنا: ''اُمید سحر کی بات سنو''، کراچی، پاکستان اسٹڈی سنٹر، ۲۰۱۱ء۔

۷۔ زاہدہ حنا: ''نہ جنوں رہا، نہ پری رہی''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

تحقیقی وتنقیدی کتب:

۱۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر: ''ناول کیا ہے؟'' کراچی، الکتاب، ۱۹۶۵ء۔

۲۔ اُرُن دھتی رائے: ''سرمایہ داریت، ریاستی جبر اور مزاحمت''، (مترجم) احمد ندیم، ملتان، سوجھلا برائے سماجی تبدیلی، ۲۰۱۲ء۔

۳۔ انوار احمد، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔

۴۔ پریم چند: ''مضامین پریم چند'' (مرتب) پروفیسر عتیق احمد، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۸۱ء۔

۵۔ حامد بیگ، مرزا: ''افسانے کا منظرنامہ''، لاہور، اورینٹ پبلشرز، ۲۰۱۲ء۔

۶۔ حمیرا اشفاق: ''جدید اُردو فکشن (عصری تقاضے اور بدلتے رُجحانات) لاہور، سانجھ، ۲۰۱۰ء۔

۷۔ خاور نوازش، محمد: ''ادب، زندگی اور سیاست''، فیصل آباد، مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

۸۔ خلیل بیگ، مرزا، ڈاکٹر: ''زبان، اُسلوب اور اُسلوبیات''، علی گڑھ، ادارۂ زبان و اُسلوب، ۱۹۸۳ء۔

۹۔ دردانہ جاوید، ڈاکٹر: ''پاکستان کی منتخب افسانہ نگار خواتین''، حیدر آباد، قصر الادب، ۲۰۰۲ء۔

۱۰۔ سلیم آغا، قزلباش، ڈاکٹر: ''جدید اُردو افسانے کے رجحانات''، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۰ء۔

۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''افسانہ حقیقت سے علامت تک''، لاہور، اظہار سنز، ۲۰۱۰ء۔

۱۳۔ ساکائے سوبوئی: ''چوبیس آنکھیں''، (مترجم) اجمل کمال، لاہور، مشعل، ۱۹۹۵ء۔

۱۴۔ عابد علی عابد: ''اُسلوب''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۶ء۔

۱۵۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر: ''اُردو افسانہ اور عورت''، ملتان، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۱ء۔

۱۶۔ فاطمہ مرنیسی: ''شہرزاد مغرب میں''، (مترجم) زاہدہ حنا، لاہور، مشعل، ۲۰۱۱ء۔

۱۷۔ فوزیہ اسلم، ڈاکٹر: ''اُردو افسانے میں اُسلوب اور تکنیک کے تجربات''، اسلام آباد، یورپ اکادمی، ۲۰۱۰ء۔

۱۸۔ قرۃ العین حیدر: ''قرۃ العین حیدر (اُردو فکشن کے تناظر میں)'' (مرتبین) حسن ظہیر، ڈاکٹر محمد ممتاز احمد خان، شہاب قدوائی، پاکستان، انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۹ء۔

۱۹۔ کشور ناہید: ''عورت زبانِ خلق سے زبانِ حال تک''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

۲۰۔ گلین ڈی پیج: ''ہلاکت گریز عالمی سیاست'' (مترجم) زاہدہ حنا، لاہور، فکشن ہاؤس،

۲۰۰۵ء۔

۲۱۔ فاطمہ حسن، ڈاکٹر: ''کتابِ دوستاں''، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء۔

۲۲۔ ماریو برگس یوسا: ''نوجوان ناول نگار کے نام خط'' (مترجم) محمد عمر میمن، کراچی، شہرزاد پبلشرز، ۲۰۱۰ء۔

۲۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر: ''تاریخ شناسی''، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۳ء۔

۲۴۔ مظہر جمیل، سید: ''آشوبِ سندھ اور اردو فکشن''، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷ء۔

۲۵۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا: ''ادب نامۂ ایران''، لاہور، نگارشات، س ن۔

۲۶۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا: ''تاریخ ایران''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء۔

۲۷۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: ''آزادی کے بعد اُردو ناول''، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۱ء۔

۲۸۔ ممتاز شیریں: ''معیار''، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء۔

۲۹۔ میلان کندیرا: ''ناول کا فن''، (مترجم) محمد عمر میمن، کراچی، شہرزاد پبلشرز، ۲۰۱۳ء۔

۳۰۔ ناہید قمر، ڈاکٹر: ''اُردو فکشن میں وقت کا تصور''، پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء۔

۳۱۔ نوشی انجم: ''سوال یہ ہے''، ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۴ء۔

۳۲۔ وارث میر، پروفیسر: ''کیا عورت آدھی ہے؟''، لاہور، جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔

۳۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''تنقیدی تھیوری کے سو سال''، لاہور، سانجھ، ۲۰۱۲ء۔

۳۴۔ وقار عظیم، سید: ''فنِ افسانہ نگار''، لاہور، اُردو مرکز، ۱۹۶۱ء۔

انگریزی کتب:

1. Liddel, Robert: "A Treatise on the Novel", Jonathan, Cape Town, London, 1965, P.26.

رسائل وجرائد:

۱۔ ادبیات (خواتین کا عالمی نمبر)، پاکستان، اکادمی ادبیات، جلد۱۴، ۱۵، شمارہ ۵۹، ۶۰، ۲۰۰۲ء۔

۲۔ اسالیب، کراچی، اسالیب پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۱۱ء، ستمبر ۲۰۱۲ء۔

۳۔ طلوعِ افکار، کراچی، دسمبر جنوری ۱۹۹۵ء۔

۴۔ قومی زبان، کراچی، جلد ۸۶، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۴ء۔

۵۔ مکالمہ، کراچی، اکادمی بازیافت، جولائی ۲۰۰۶ء تا دسمبر ۲۰۰۷ء۔

۶۔ نوائے وقت، ۱۸ جولائی ۲۰۰۹ء۔

۷۔ روزنامہ ایکسپریس، ۲۲ مارچ ۲۰۰۹ء۔

لغات:

۱۔ انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا، لاہور، الفیصل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔

غیر مطبوعہ مقالات:

۱۔ ارم سلیم: ''کشور ناہید اور زاہدہ حنا کے کالموں میں تانیثیتی شعور''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، ملتان، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء۔

۲۔ عذرا لیاقت: ''بیسویں صدی کی نمائندہ افسانہ نگار خواتین''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، ملتان، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء۔

۳۔ کنول رعنا: ''زاہدہ حنا (شخصیت وفن)''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے، جامشورو، جامعہ سندھ، ۱۹۹۷ء۔

زاہدہ حنا اپنی افسانوی تحریروں میں نسائی شعور کے حوالے سے شہرت رکھتی ہیں۔ آسیہ نازلی ان کی نقاد بن کر ابھری ہیں۔ پہلے انھوں نے ''زاہدہ حنا۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی جس میں حسینہ معین، رضیہ فصیح احمد، ڈاکٹر فاطمہ حسن، مظہر جمیل، فردوس حیدر، ادیب سہیل، ستیہ پال آنند، احمد عقیل روبی، ڈاکٹر مظہر عباس، شاہدہ حسن، ایم خالد فیاض اور پروفیسر علی احمد فاطمی جیسے نمایاں ادیبوں کی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے۔ اب ان کا ایم فل کا مقالہ ''زاہدہ حنا کا افسانوی ادب'' زیرِ اشاعت ہے جس میں انھوں نے زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ لگ بھگ سو صفحات کو محیط ہے جس میں انھوں نے زاہدہ حنا کے اسلوب، کردار نگاری، تکنیک پر بات کرنے کے ساتھ ان کے سیاسی، سماجی، تاریخی، فلسفیانہ اور نسائی شعور کی بازیافت بھی کی ہے۔ ایک باب زاہدہ حنا کی ناولٹ نگاری کے لیے مخصوص ہے۔ آسیہ نازلی کا اسلوبِ تحقیق و تنقید رواں، سادہ اور قابل مطالعہ ہے جو اپنی سادگی کے باوصف تنقید کے لیے بہت مناسب ہے اور ادب کی قاری کو مطالعہ کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک کم یاب خصوصیت ہے کیونکہ بیشتر ایم فل کے سکالرز اور اکثر نقاد بھی اس وصف سے محروم ہوتے ہیں جس کی وجہ سے تنقید کے قارئین کا حلقہ محدود ہوا ہے۔ ان میں فکشن کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی امید افزا ہے، یقیناً وہ اس صلاحیت کو مستقبل میں اور بڑھا کر مزید قابل قدر کام بھی کریں گی۔ ان کا یہ کام زاہدہ حنا کو سمجھنے میں یقیناً معاونت کرے گا اور زاہدہ حنا کو پڑھنے میں آسانی پیدا کرے گا۔ تنقید کے میدان میں ان کی ابتدا بہت اچھی ہے اور ان کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اللہ کرے کہ وہ اس کام کو سندی تحقیق سے آگے لے جائیں اور زیادہ مشکل فکشن نگاروں کی تفہیم کا فریضہ بھی انجام دیں۔

ڈاکٹر ضیاء الحسن

پنجاب یونیورسٹی لاہور